ٹوٹے ہوئے پر

کتب خانہ علم و ادب دہلی

ٹوٹے ہوئے پر

مصنّفہ

جبران خلیل جبران

ترجمہ

حکیم حبیب اشعر دہلوی

مکتبہ خانہ علم و ادب دہلی

عمدہ پریس، دلّی گیٹ دھلی

طبع دوم ۱۹۴۷ء قیمت ھہ/

میں اپنی کتاب (ایم۔ ای۔ ایچ) کے نام

معنون کرتا ہوں! ۔

جس کی بے حس آنکھیں سورج کو ٹکٹکی

باندھ کر دیکھتی ہیں!

جو اپنی غیر مرتعش انگلیوں سے آتش پاروں کو

پکڑ لیتی ہے، جو اندھوں کی چیخ پکار اور نالہ و فریاد

کی تہ میں روحِ کائنات کا دلکش و دل پذیر نغمہ

سنتی ہے۔

جبرانؔ

جبران خلیل جبران

عربی زبان کا مشہور صاحب طرز ادیب، جبران خلیل جبران ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوا مقام پیدائش "بشری" ہے، جو "لبنان" کے مضافات میں "الارز المخالد" کے قریب واقع ہے۔ ابتدائی زندگی شمالی لبنان کی آزاد فضا میں گزری۔ بارہ برس کی عمر میں ترک وطن کر کے ممالک متحدہ امریکہ چلا گیا۔ چند سال وہاں ٹھہر کر عربی زبان و ادب کی تحصیل کیلئے بیروت آیا اور "مدرسہ حکمت" میں داخل ہو گیا۔

۱۹۰۳ء میں امریکہ واپس ہوا، اور پانچ برس تک وہاں رہا، اس عرصہ میں اس کا زیادہ تر قیام "بوسٹن" میں رہا۔ جہاں اس نے کچھ کتابیں، عربی زبان میں تالیف کیں۔

۱۹۰۸ء میں مصوری اور دیگر فنون لطیفہ کی تکمیل، نیز یورپ کے بڑے بڑے شہروں کی سیاحت کے لئے، پیرس کا سفر کیا۔ تین سال پیرس میں رہ کر "جامعہ فنون فرانسیسی" سے امتیازی سند حاصل کی اور "مجلس فنون فرانسیسی" کا رکن مقرر کیا گیا۔

۱۹۱۲ء میں پھر امریکہ گیا اور "نیویورک" میں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ یہاں اس نے عربی اور انگریزی میں بہت سی کتابیں اور مقالے لکھے، جن کی وجہ سے وہ ساری دنیا کے اہلِ فن کی نگاہوں کا مرکز بن گیا۔ اس کی مشہور عربی مؤلفات یہ ہیں:۔

(۱) دمعۃ و ابتسامۃ (۲) الموسیقی (۳) عرائس المروج (۴) الاجنحۃ المتکسرہ (۵) العواصف (۶) الارواح المتمردہ (۷) البدائع والطرائف (جس میں عرب کے فلسفیوں کی تصویریں بھی شامل ہیں) (۸) المواکب۔ ان کتابوں کے علاوہ کچھ غیر فانی مقالات ہیں، جو مختلف اوقات میں شائع ہو کر یورپ کی اکثر زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ اس کی انگریزی تالیفات، بہ ترتیب ذیل ہیں:-

(۱) المجنون (۲) السابق (۳) النبی (۴) رملٌ و زبدٌ۔ یہ چاروں کتابیں عربی میں منتقل ہو چکی ہیں۔ جبران کی ایک اور کتاب "الرسوم العشرون" کے نام سے ہے، جو اس کے سحر آفریں موقلم کی اشاراتی تصویروں کا نادرِ روزگار مجموعہ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی تھی۔

جبران کی انگریزی تالیفات دنیا کی اکثر زندہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں لہ مسرت کا مقام ہے کہ اردو بھی جبران خلیل جبران کے افکار سے ناآشنا نہیں ہے۔ سب سے پہلے قاضی عبدالغفار، مصنف "لیلیٰ کے خطوط" نے اس کے انگریزی شاہکار "النبی" کا ترجمہ "اس نے کہا" کے نام سے کیا۔ پھر اسی کتاب کا دوسرا ترجمہ "مسائلِ حیات" لاہور سے شائع ہوا۔ اس کے بعد ابوالعلا چشتی نے "الارواح المتمردہ" کو "سرکش روحیں" کے نام سے براہ راست عربی سے اردو میں منتقل کیا۔ سب سے آخر میں بشیر ہندی نے "پاگل" ملک کے سامنے پیش کی، جو "المجنون" کے غالباً انگریزی ایڈیشن کا ترجمہ ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ کچھ مضامین اور افسانوں کے تراجم ہیں، جو صلاح الدین قریشی، رضا انصاری اور راقم سطور کی طرف سے مختلف ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں زیر نظر کتاب، جبران کے ایک المیہ ناول "الاجنحۃ المتکسرہ" کا عربی سے ترجمہ ہے

میں نے پوری کوشش کی ہے۔ کہ مصنف کا طرز بیان اور اس کی خوبیاں، جس حد تک ممکن ہو سکے ۔ اردو میں منتقل کروں ۔ مگر پھر بھی کہیں کہیں زبان اور محاورات کے اختلاف نے مجھے اپنے مقصد سے ہٹا دیا ہے اور اس کے لیے میں بالکل مجبور تھا۔

اصل ناول کے متعلق میں کچھ نہیں کہتا، مطالعہ کے بعد آپ کو خود اندازہ ہو جائیگا کہ یہ تصنیف جدت بیان، ندرت تخیل اور عمق فکر کے لحاظ سے افسانوی ادب میں کیا درجہ رکھتی ہے ؟

۱۹ر جولائی ۱۹۳۴ء

حبیب اشعر

سلہ یہ تمام حالات "رمل وزبد" اور "بلاغة العرب فی القرن العشرین" سے ماخوذ ہیں (مترجم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱)

آغاز

میری عمر اٹھارہ برس کی تھی، جب محبت نے اپنی سحر آفریں شعاعوں سے میری آنکھیں کھولیں اور پہلے پہل میرے من کو اپنی آتشیں انگلیوں سے مس کیا۔"

سلمیٰ پہلی عورت تھی، جس نے اپنے محاسن سے میری روح کو بیدار کیا اور مجھے جذبات عالیہ کی جنت میں لے گئی۔ جہاں دن خواب ہائے نوشیں کی طرح بسر ہوتے ہیں اور راتیں شب ہائے زفاف کی طرح۔

سلمیٰ ہی تھی، جس نے اپنی رعنائیوں سے مجھے 'پرستشِ حسن' کے آداب سکھائے اور اپنی عنایتوں سے مجھ پر محبت کے اسرار منکشف کئے تھے! وہی تھی، جس نے حیاتِ معنوی کے قصیدہ کا مطلع اوّل میرے کانوں میں گُن گنایا:

کون سا نوجوان ہے، جو اس نوخیز حسینہ کی یاد سے اپنے لمحات تنہائی کو پُر کیف

نہیں بناتا، جس نے اپنے لطف و کرم اور حلاوت و شیرینی سے اس کے خواب جوانی کو ایک ایسی خوفناک بیداری سے بدل دیا ہو، جو حیرت انگیز بھی ہو اور ہلاکت بار بھی؟ ہم میں کون ہے، جو اس انوکھی ساعت کے لیے نہیں تڑپتا، جس میں وہ دفعتہً ہوشیار ہوا ہو، اور دیکھا ہو کہ اس کا دل یکسر منقلب ہو گیا ہے۔ دل کی گہرائیوں میں وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ اور وہ تاثرات، رازداری کی تمام تلخیوں کے باوجود خوشگوار، اور آنسوؤں، تمناؤں اور بیداریوں کو محیط ہونے کے باوصف پسندیدہ ہیں؟

جوانی کے مست و بے پروا لمحوں میں سلمٰی ہر نوجوان کو دعوتِ نظر دے کر اس کی تنہائیوں کے لیے ایک شاعرانہ مقصود پیدا کر دیتی ہے اور اس کی وحشت ایام کو زندہ دلی اور سکوت شب کو نغموں سے بدل دیتی ہے۔

میرا ذہن، فطری رجحانات اور نظری الہامات کی کشاکش میں مبتلا تھا، جب میں نے محبت کو سلمٰی کے ہونٹوں پر کھیلتے اور اپنی روح سے سرگوشیاں کرتے پایا میری زندگی ...... آدم کے فردوسی خواب گراں کی مانند........ تنہا، ویران اور سرد تھی۔ جب میں نے سلمٰی کو اپنے سامنے اس طرح کھڑے دیکھا، جیسے کسی تاریک مقام پر روشن منارہ! اس لیے سلمٰی میرے پُراسرار اور عجائب پناہ دل کی حوّا ہے۔ جس نے اسے رازِ ہستی سمجھایا اور آئینہ بنا کر دنیا کے سامنے کھڑا کر دیا۔

حوّا نے آدم کی اطاعت و سادگی سے فائدہ اٹھا کر، دانستہ اسے جنت سے نکلوایا۔ مگر سلمٰی نے میرے ظرف کا اندازہ لگا کر، اپنی محبوبیت کی رہنمائی میں، مجھے محبت اور پاکیزگی کی جنت میں پہنچایا۔ لیکن آہ! آدمؑ اتنا مصیبت زدہ نہ تھا، جتنا میں ہوں!! وہ آتشیں تلوار، جس نے آدمؑ کو جنت سے نکالا، اس تلوار جیسی ہے،

جس نے مجھے اپنی باڑھ کی چمک سے خائف کیا - اور اس سے پہلے کہ میں پیمانِ وفا کی خلاف ورزی کرتا، یا خیر و شر سے ذوق آشنا ہوتا - نفرت و حقارت کے ساتھ مجھے فردوسِ محبت سے دھکے دے کر نکال دیا۔

اور آج، کہ تاریک ماہ و سال، اس زمانہ کے ہر نقش کو اپنے پاؤں سے مسلتے ہوئے گزر گئے ہیں - میرے لیے اس حسین خواب میں سے کچھ باقی نہیں رہا سوائے اس درد انگیز یاد کے، جو میرے سر پر ان پروں کی طرح منڈلاتی ہے، جو نظر نہ آئیں .... وہ یاد، جو میری پلکوں سے نا امیدی و غمگینی کے آنسوؤں کا خراج مانگتی ہے -

اور سلمیٰ ..... حسین و شیریں گفتار سلمیٰ! آہ، وہ شفق رنگین کے اس پار چلی گئی ہے، اور اب اس دنیا میں، میرے دل کی الم ناک گھٹن اور اس کی سر سبز قبر کے علاوہ، جو سرو کے درختوں کی چھاؤں تلے ہے، اور کوئی نشانی نہیں۔ اس لیے اس کی قبر اور میرا دل، بس یہ دو ہیں، جنہیں اس کے وجود کی خاموش مگر مکمل داستان کہا جا سکتا ہے۔

البتہ وہ خاموشی، جو قبروں پر مسلط اور ان رازوں کی پردہ دار ہے۔ جنہیں اللہ نے دنیا کی نگاہ سے بچا کر تابوت کی ظلمتوں میں چھپا رکھا ہے - اور وہ ... شاخیں، جو جسمانی عناصر سے نمو پاتی ہیں - اور اپنی سرسراہٹ سے قبر کے بھیدوں کو ظاہر نہیں کرتیں - سلمیٰ کے وجود پر تھوڑی بہت روشنی ڈالتی ہیں - لیکن میرے دل کا پیچ و تاب تو اس کے وجود کی منہ بولتی تصویر ہے - اور یہی وجہ ہے کہ میرے دل کا درد ہنوز میری آنکھوں سے ٹپکتا ہے - سیاہ روشنائی کے ان قطروں کے

کے ساتھ، جو محبت، حسن اور موت کے اسٹیج کئے ہوئے ڈرامہ کی پرچھائیوں سے روشن ہیں۔

اس لیئے اے یاران بیروت! جب کبھی تم اس قبر پر جاؤ، جو صنوبر کے جنگل کے قریب ہے۔ تو خاموشی کے ساتھ، آہستہ آہستہ جانا، مبادا تمہارے قدم زیر زمیں سونے والوں کی شکستہ ہڈیوں کو زیر وزبر کردیں۔ اور سلمیٰ کی قبر کے ایک طرف عزت واحترام کے ساتھ کھڑے ہونا، اس مقدس خاک سے الگ ہٹ کر جس میں سلمیٰ کا وجود جذب ہو چکا ہے۔ پھر ٹھنڈا سانس بھر کر مجھے یاد کرنا اور اپنے دل میں کہنا:

"یہی وہ جگہ ہے، جہاں اس نوجوان کی امیدیں دفن ہیں، جسے زمانہ کی گردشوں نے سمندر پار پھینک دیا تھا۔ ہاں! یہی وہ جگہ ہے، جہاں اس کی تمنائیں پوشیدہ ہیں۔ جہاں اس کی مسرتیں گوشہ گیر ہیں، جہاں اس کے آنسو جذب ہیں۔ اور جہاں اس کے تبسم پھیکے پڑے ہیں۔

انہیں خاموش قبروں میں اس کی اداسی، سرو اور بید کے درختوں کے ساتھ بالیدگی حاصل کرتی ہے اور اسی قبر کے گرد، راتوں کو اس کی روح منڈلاتی ہے۔ ماضی کی یاد تازہ کرتے ہوئے۔ ہجر وتنہائی کی دھندلی تصویروں کے ساتھ یاس ونومیدی کے نوحوں کو دہراتے ہوئے۔ اور سرو وبید کی شاخوں کے ساتھ اس نوبہار شباب، پر ماتم کرتے ہوئے۔ جو کل تک زندگی کے ہونٹوں کا افسردہ نغمہ تھی۔ اور آج زمین کے سینے کا خاموش راز ہے۔

اے یاران شباب! میں تمہیں ان عورتوں کی قسم دیتا ہوں، جنہیں تمہارے

دل پیار کرتے ہیں، کہ تم اس عورت کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھاؤ، جب میرا دل پیار کرتا ہے، اس لئے کہ وہ پھول، جو تم کسی فراموش شدہ قبر پر ڈالتے ہو شبنم کے اس قطرہ کی مثال ہوتا ہے، جو عروسِ سحر کی پلکوں سے ٹپکی ہوئی گلاب کی پتیوں پہ گرتا ہے۔

(۲)

غمِ خاموش

لوگو! صبحِ جوانی کو یاد تم بھی کرتے ہو، اور میں بھی!! لیکن اتنا فرق ہے کہ تم اس عہدِ رنگیں کے گزر جانے پر افسوس کرتے ہو اور چاہتے ہو کہ کسی نہ کسی طرح وہ زمانہ واپس آجائے۔ اور میں اس پرفریب دور کو اس طرح یاد کرتا ہوں جیسے نو آزاد قیدی، قید خانہ کی دیواروں اور زنجیر کی گراں باریوں کو یاد کرتا ہے۔

تم بچپن اور جوانی کے درمیان آنے والے عہدِ زرّیں کو پکارتے ہو، جو غمِ روزگار اور وسوسۂ حیات کی چھنی اڑاتا، اور افکار و مشاغل کے سروں سے اپنے بازو پھڑپھڑا کر اس طرح گزر جاتا ہے، جیسے شہد کی مکھی، پھولوں سے لدے پھندے باغوں کی سیر کرتے ہوئے گندے تالابوں سے گزرے

مگر میں خود میں اتنی ہمت نہیں پاتا کہ اپنے عہدِ شباب کو آواز دوں،

میں اگر آواز دے سکتا ہوں تو اُن خاموش و مخفی آلام کے درد کو، جو میرے دل میں جاگزیں ہیں اور جب کبھی اُبھرتے ہیں، طوفان اور آندھی کی طرح اُبھرتے ہیں۔ یہ آلام، دل کے ساتھ ساتھ نمو پاتے اور فزوں سے فزوں تر ہوتے جاتے ہیں۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ ان آلام کی کثرت، خود ان کے لیے عالم معرفت کی راہ بند کر دیتی ہے۔ اور یہ دل ہی میں گھٹ کر رہ جاتے ہیں۔ اس وقت محبت آتی ہے۔ اور دل کے دروازے کھول دیتی ہے۔ محبت کی روشنی سے دل کا گوشہ گوشہ منور ہو جاتا ہے۔

یہی کچھ مجھ پر بیتی۔ محبت نے میری زبان کھولی اور میں بولنے لگا۔ میری پلکوں کو تر بتر کیا اور میں رونے لگا۔ میرے حلق اور سینہ کی گھٹن کو دور کیا اور میں ٹھنڈے سانس بھرنے اور آہ و فریاد کرنے لگا۔

لوگو! تم ان کھیتوں، باغوں، میدانوں اور گلی کوچوں کو یاد کرتے ہو، جنہوں نے تمہارے کھیل تماشے دیکھے اور تمہاری معصومانہ سرگوشیاں سُنی ہیں اور میں شمالی لبنان کے ان آثار کو یاد کرتا ہوں، جو زمانہ کی دست برد سے بچ گئے ہیں۔ بلکہ میری حالت تو یہ ہے کہ جب کبھی فضلائے عالم کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کرتا ہوں۔ اُن وادیوں کو طلسم و جلال سے لبریز اور ان پہاڑوں کو عظمت و امتیاز کے ساتھ، آسمان سے باتیں کرتے دیکھتا ہوں۔ اور جب کبھی سماجی ہنگاموں کی طرف سے اپنے کان بند کرتا ہوں، اُن آبشاروں کی روانی اور اُن شاخوں کی سرسراہٹ کی آوازیں سنتا ہوں۔

لیکن وہ خوبیاں جن کا میں اب ذکر کر رہا ہوں اور جن کی طرف میں

اس شوق و رغبت سے لپک رہا ہوں، جس شوق و رغبت سے دودھ پیتا بچہ، آغوشِ مادر کی طرف لپکتا ہے۔ وہ میں، جو نہ سے میری روح...... جو شباب کی تاریکیوں میں گھری ہوئی ہے۔...... دردناک ہوتی ہے۔ جیسے پرندوں کے غول کو فضائے بسیط میں آزادی کے ساتھ پرواز کرتے دیکھ کر، مقید پرندہ قفس کی تیلیوں سے سر ٹپکتا ہے۔ ہاں! یہ خوبیاں وہ ہیں، جو میرے سینے کو سوچ بچار کے درد اور غور و فکر کی تلخی سے لبریز کر دیتی ہیں۔ اور میرے دل کے اردگرد، حیرت و اشتباہ کی انگلیوں سے یاس و ناامیدی کا پردہ تان دیتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب کبھی دشت پیمائی کے لیے نکلتا ہوں، تو غمگین ہو کر لوٹ آتا ہوں۔ ایسی حالت میں کہ اسبابِ غم بھی میری نگاہوں سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ سرِ شام سورج کی شعاعوں سے رنگین بادلوں کو دیکھتا ہوں تو طبیعت میں ایک گرفتگی سی محسوس ہوتی ہے، وہ تباہ کن گرفتگی، جس کے مطالب و معانی، میرے جہل کی بنا پر وسیع سے وسیع تر ہو جاتے ہیں اور کوئل کی کوک یا آبشار کا نغمہ سنتا ہوں تو غم کی تصویر بن کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اور نہیں جانتا کہ اس حزن و ملال کے محرکات کیا ہیں؟

کہتے ہیں جہالت بے فکری کا گہوارہ ہے۔ اور بے فکری راحت و آرام کا بستر! یہ قول ان لوگوں کے نزدیک صحیح ہے، جو مُردوں کی طرح پیدا ہوتے اور جمادات کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔

لیکن یہی اندھی جہالت، اگر اپنا مسکن بیدار جذبات کے آس پاس

بناتے تو دوزخ کے ساتویں طبقے سے بھی دور اور موت سے بھی زیادہ تلخ ہو جاتی ہے۔

وہ حساس نوجوان، جو محسوس زیادہ کرتا ہے اور سمجھتا کم ہے، کائنات کی سب سے زیادہ بدقسمت مخلوق ہے، اس لیے کہ اس کی ذات، دو ہلک، اور مختلف قوتوں میں گھری ہوتی ہے، ایک مخفی قوت، جو اسے بادلوں کی دنیا میں لے جاتی ہے .... اور خیال و خواب پر چھائی ہوئی کہر کے پیچھے سے کائنات کے محاسن کا مشاہدہ کراتی ہے اور دوسری ظاہری قوت، جو اسے زمین پر پابہ گل رکھتی ہے۔ اور اسکی بصیرت کو گرد و غبار سے ناکارہ کر کے محشرستانِ ظلمت میں اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ دیتی ہے کہ وہ ہر قدم پر ٹھوکریں کھاتا اور خوف و دہشت کے مارے مرا جاتا ہے۔

غم کے ہاتھ دیکھنے میں نرم و نازک، مگر واقعتہً بہت قوی ہیں، جو ہمارے دلوں پر قابو پاتے اور تنہائی میں انہیں تکلیف پہونچاتے ہیں، اس لیے کہ تنہائی غم کی رفیق ہے جس طرح غم، روحانی شورشوں کا معاون ہے اور نوجوان کی روح، جس کے ایک پہلو میں تنہائی کی اثر اندازیاں ہوں اور دوسرے پہلو میں غم کی اثر آفرینیاں، سفید چنبیلی کے پھول سے مشابہ ہے۔ جو کھلتے وقت، ہوا کے سامنے تھرتھراتا، صبح کی شعاعوں کے لیے اپنا سینہ چاک کرتا۔ اور شام کے تصور ہی سے مرجھا کر رہ جاتا ہے

یہی وجہ ہے کہ بدقسمت نوجوان کے لیے خانہ نشینی مفر ہے،

جس میں وہ اپنے فکر کو مشغول رکھ سکے، نہ کوئی مونس و ہمدرد، جو اس کا شریک غم ہو سکے، زندگی اس کے لیے ایک تنگ و تاریک قید خانہ ہے، جہاں دیکھنے کے لیے مکڑی کے جالے اور سننے کے لیے حشرات الارض کی آوازیں ہیں اور بس!

بالکل اسی طرح، میرے غم نے بھی، جو میرے بچپن کا کارواں سالار تھا، میری ضرورتوں کو، اپنی شدت و کثرت کی بنا پر، کھیل تماشوں کی طرف مائل ہونے دیا، نہ مجھے کسی دوست کی احتیاج محسوس ہونے دی، کیونکہ میں جہاں جاتا تھا، اسی کو پاتا تھا۔ وہ میرے نفس کا ایک فطری روگ تھا، جس نے مجھے عزلت پسند بنا دیا اور میری روح کے تمام جراثیم لہو ولعب کو موت کی نیند سلا دیا۔ جس نے میرے شانوں سے جوانی کے پر و بال اکھاڑ پھینکے اور اس ہنگامہ زار ہستی میں مجھے اس کوہستانی حوض کی مثال بنا دیا۔ جس کے ٹھہرے ہوئے پانی میں فضا کے دھندلکے بادل کی زنگار رنگی اور شاخوں کی لچک کا عکس تو پڑ رہا ہو، لیکن اُسے کوئی راستہ نہ ملتا ہو، جس سے، ندی کی طرح گاتے ہوئے گزر کر وہ سمندر سے جا ملے۔

اٹھارہ (۱۸) سال کی عمر سے پہلے پہلے، میری زندگی یہ تھی، لیکن میری عمر کا اٹھارواں سال میرے ماضی میں اتنا بلند مقام رکھتا ہے، جیسے پہاڑ کی چوٹی! یہ اسی سال کی کرم گستری ہے کہ اس نے مجھے دنیا پر غور کرنے کا سلیقہ سکھایا اور انسان کی مختلف راہوں، اس کے جذبات کی سبزہ

زاویں، اس کے مصائب کی گھاٹیوں اور اس کی قانونی اور رواجی پابندیوں کے غاروں کا نہایت قریب سے مشاہدہ کرایا۔

اسی سال، میری نشاۃ ثانیہ ہوئی، کیونکہ جو شخص، اپنے وجود میں غم کا محتاج نہ ہو، جس نے یاس و نومیدی کے پیٹ میں پاؤں نہ پھیلائے ہوں اور جسے محبت نے خوابوں کے ہنگوڑے میں نہ جھلایا ہو، اس کی پوری زندگی کتاب ہستی کے سادہ اور سفید ورق سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔

اسی سال میں نے ایک حسین عورت کی پلکوں کے پیچھے سے، آسمانی فرشتوں کو اپنی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھا اور اسی سال ایک گنہگار کے سینے میں جہنمی شیطان مجھ پہ چیختے چلاتے اور دوڑتے بھاگتے نظر آئے جو شخص زندگی کی خوبیوں اور برائیوں میں، فرشتوں اور شیطانوں کو نہیں دیکھتا، وہ معرفت سے بیگانہ اور جذبات سے محروم رہتا ہے۔

(۳)

دستِ قضا

اسی نادرہ کار سال کے موسم بہار کا ذکر ہے، میں بیروت میں تھا کہ ماہِ اپریل سبزہ آفرینیوں اور گل باریوں کی تمام کیفیتوں کے ساتھ آیا۔ بیروت کے باغوں میں سبزہ و گل کی یہ کثرت ہوئی کہ معلوم ہوتا تھا، زمین نے اپنے بھیدوں کے سارے خزانے آسمان کے لیئے اُگل دیئے ہیں۔ سیب اور بادام کے درخت خوشبودار سفید لباس میں ملبوس تھے اور عمارتوں کے درمیان ایسے معلوم ہو رہے تھے، گویا حوریں سفید رنگ کا نفیس لباس پہنے کھڑی ہیں جنہیں فطرت نے شاعروں اور ادیبوں کے لیئے دلہن بنا کر بھیجا ہے۔

یوں ہونے کو تو بہار کا موسم ہر جگہ دلکش ہوتا ہے، لیکن شام میں اسکی دلکشی کچھ اور ہی کیفیت اختیار کر لیتی ہے۔ بہار، امنجانِ فطرت کی روح ہے۔

جو ساری کائنات کا نہایت تیزی سے طواف کرتی ہے، لیکن جب شام میں پہونچتی ہے، تو اپنی رفتار سست کر دیتی ہے۔ وہ فضائے شام میں اڑتی ہوئی جلیل القدر شہنشاہوں اور پیغمبروں کی روحوں سے انس کی بنا پر پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی ہے۔ یہودی گزرگاہوں کے غیر فانی داؤدی نغموں سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور لبنان کے صنوبری درختوں کے ساز پر عظمتِ رفتہ کے گیت گاتی ہے۔

بیروت میں بہار کا موسم، باقی تمام موسموں سے زیادہ حسین اور دلکش ہوتا ہے، کیونکہ اس موسم میں یہاں نہ جاڑوں کا کیچڑ پانی ہوتا ہے، نہ گرمیوں کا گرد و غبار، جاڑوں کی بہاوٹ اور گرمیوں کی تپش کے درمیانی موسم میں، بیروت اس حسین دوشیزہ سے مماثل ہوتا ہے، جو دریا میں نہا کر، لبِ ساحل بیٹھی اپنے جسم کو سورج کی شعاعوں سے خشک کر رہی ہو۔

اپریل کی ہوش ربا رنگینیاں اور زندگی بخش مسکراہٹیں شباب پر تھیں کہ میں اپنے ایک دوست سے ملاقات کے لئے گیا، جو سماجی ہنگاموں سے دور ایک تنہا مقام پر سکون و اطمینان کی زندگی بسر کرتا تھا۔ ہم دونوں اپنی اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی تصویریں الفاظ میں کھینچ رہے تھے، کہ ایک پینسٹھ ۶۵ سال کا بوڑھا کمرہ میں داخل ہوا جس کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے اور سال خوردہ خدو خال، عظمت و وقار کے آئینہ دار تھے۔

میں احتراماً کھڑا ہو گیا، لیکن اس سے پہلے کہ میں نیاز مندانہ طور پر اس سے مصافحہ کرتا، میرا دوست آگے بڑھا اور کہا۔

"حضرت فارس آفندی کرامہ!"

اس کے بعد اس نے توصیفی الفاظ میں میرا تعارف کرایا، نووارد نے تھوڑی دیر تک مجھے بہت غور سے دیکھا، اور پھر اپنی بلند پیشانی کو، جس پر سفید بالوں کا برفانی تاج رکھا تھا، انگلیوں سے پکڑ کر کچھ سوچنے لگا، گویا اپنے حافظہ میں کسی گزشتہ صورت کی یاد تازہ کر رہا ہے۔

وہ مسکرایا اور میرے قریب آکر مسرت آمیز لہجہ میں کہنے لگا۔

"تم میرے ایک پرانے دوست کے بیٹے ہو، جس کی صحبت میں میں نے اپنی ایک چوتھائی عمر گزاری ہے۔ نہیں کہہ سکتا کہ تمہیں دیکھ کر مجھے کس قدر خوشی ہوئی اور تمہارے والد سے ملاقات کا کتنا شوق میرے دل میں پیدا ہوا۔

میں اس کی گفتگو سے بہت متاثر ہوا۔ اور میں نے اپنے دل میں ایک مخفی جذبہ محسوس کیا، جو آہستہ آہستہ مجھے اس سے قریب کر رہا تھا، جیسے آندھی آنے سے پہلے پرندے کو اس کی فطرت، آشیانے کی طرف لیجاتی ہے۔

ہم سب بیٹھ گئے۔ اور فارس آفندی نے میرے والد کے ساتھ اپنے خلوص کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ بار بار جوانی کے اس دور کو یاد کر رہا تھا، جو اس نے میرے والد کی رفاقت میں گذارا تھا، اور ہمیں گزشتہ دنوں کے واقعات سنا رہا تھا جنہیں زمانہ نے اس کے دل کے ساتھ کفنا کر، اس کے سینہ میں دفن کر دیا تھا۔

عمر رسیدہ لوگ، قصوّر کے ذریعہ اپنے عہد شباب کی طرف اس طرح لوٹتے ہیں جیسے کوئی غریب الوطن، دل میں شوق و ارمان کی دنیا بسائے اپنی جنم بھومی کی طرف لوٹتا ہے اور جوانی کی مسلسل حکایتیں اس طرح سناتے ہیں، جیسے شاعر اپنا بہترین قصیدہ گن گناتا ہے۔ اُن کی روحیں ماضی کے

گوشوں میں الجھی رہتی ہیں۔ اس لئے کہ حال، بے پروایانہ انداز میں، اُن کے برابر سے گزر جاتا ہے، اور مستقبل فنا کی کہر اور قبر کی تاریکی کا نقاب ڈال کر اُن کی نگاہوں کے سامنے آتا ہے۔

ایک گھنٹے کے بعد، جو داستان ماضی میں اس طرح گزر گیا، جیسے شاخوں کا سایہ گھاس سے گزر جاتا ہے۔ فارس کرامہ جانے کے لئے کھڑا ہوا۔ الوداعی طور پر جب میں اس سے قریب ہوا، تو اس نے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھا اور کہا:۔

تمہارے والد کو دیکھے، مجھے بیس برس ہو گئے ہیں، لیکن مجھے امید ہے کہ تمہاری مسلسل ملاقاتیں، اس طویل مدت فراق کی تلافی کر دیں گی؛

جیسا کہ ایک سعادت مند بیٹے کو اپنے باپ کے دوستوں کے سامنے چاہیئے۔ میں نے شکر گزاری کے طور پر اپنا سر جھکایا اور وعدہ کیا کہ تعمیل ارشاد کروں گا

فارس کرامہ کے چلے جانے کے بعد، میں نے اپنے دوست سے اس کے متعلق مزید حالات معلوم کرنے چاہے۔ اجتنابی لہجہ میں، میرے دوست نے جواب دیا۔

”میں بیروت میں فارس کرامہ کے علاوہ کسی کو نہیں جانتا، جس کی فضیلت کا سبب اس کا مال و متاع، اور مال و متاع کا سبب، اس کی فضیلت ہو۔ وہ اُن گنے چنے لوگوں میں سے ہے، جو اس دنیا میں آتے ہیں اور کسی ایک متنفس کو تکلیف پہنچائے بغیر رخصت ہو جاتے ہیں“!

اس قسم کے لوگ عام طور سے بدقسمت اور مظلوم ہوتے ہیں، کیونکہ وہ ہوشیاری اور چالاکی کے اُن راستوں سے بے خبر ہوتے ہیں، جو انہیں مکر و خباثت کے پتلوں کے ہتھکنڈوں سے محفوظ رکھ سکیں۔

فارس کرامہ کی ایک اکلوتی لڑکی ہے، جو شہر سے باہر ایک عالیشان کوٹھی میں اپنے باپ کے ساتھ رہتی ہے۔ اخلاق و عادات کے اعتبار سے وہ فارس کرامہ کی جیتی جاگتی تصویر، اور حسن و نزاکت کے اعتبار سے، ساری عورتوں میں ایک ہے۔۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ بھی اپنے باپ کی طرح بدقسمت ہوگی کیونکہ اس کے والد کی دولت و عظمت نے اسے ایک خوفناک و تاریک جہنم کے کنارے، لا کھڑا کیا ہے"

آخری کلمات ادا کرتے وقت میرے دوست کے چہرہ پر رنج اور افسوس کے آثار شدت کے ساتھ نمایاں ہوگئے، لیکن اس نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا

"فارس کرامہ دل کا شریف اور عادت کا نیک سہی، لیکن ارادہ کا کمزور ہے۔ لوگوں کی مکاریوں اور حرص و طمع نے اُسے اندھا اور گونگا بنا دیا ہے۔ تاہم اس کی بیٹی اس کے ہر حکم اور ہر خواہش کی تعمیل کرتی ہے، عام اس سے کہ وہ اس کی فطری صلاحیتوں کے بالکل خلاف ہی کیوں نہ ہو،

یہ ایک گھناؤنا راز ہے، جو ان باپ بیٹی کی زندگیوں میں پوشیدہ ہے جو اتفاق سے اس بھید کو ایک شخص نے پالیا ہے، جو لالچ اور ریاکاری، خباثت اور ذہانت کا مجسمہ ہے۔ یہ شخص ایک پادری ہے۔ جس کی بدفعالیاں بھی، انجیل کے زیر سایہ ہونے کی وجہ سے، عام نگاہوں میں فضائل کا درجہ رکھتی ہیں"

وہ مذہب پرست شہروں میں دین کا امام سمجھا جاتا ہے، جس کا خوف اجسام سے گزر کر، ارواح پر طاری ہے۔ لوگ اس کے سامنے اپنی ضعیف الاعتقادی کی بنا پر اس طرح جھکتے ہیں، جیسے قصاب کے سامنے بھیڑ بکریوں کی گردنیں۔

اس پادری کا ایک بھتیجا ہے، جس کے نفس میں عیاریوں اور مکاریوں کے عناصر اس طرح متصادم رہتے ہیں، جیسے غاروں اور تالابوں میں سانپ اور بچھو! میرے خیال میں وہ دن دور نہیں ہے، جب یہ پادری سیاہ لباس پہنے، دائیں جانب اپنے بھتیجے اور بائیں جانب فارس کرامہ کی لڑکی کو لئے کھڑا ہوگا۔ اور اپنے گنہ گار ہاتھوں سے ان کے سروں پر ازدواجی تاج رکھے گا۔

وہ ایک پاک جسم کو، ایک متعفن لاش کے ساتھ افسوں طرازی کی زنجیروں میں جکڑے گا۔ اور ایک آسمانی رُوح کو، ایک متعفن مادّی پیکر کی شب آرائیوں کے لئے، ناکارہ قانون کے قبضہ میں دے دے گا۔

فارس کرامہ اور اس کی بیٹی کے متعلق، جو کچھ میں تمہارے سامنے بیان کر سکتا تھا بیان کر دیا، اب تم اس سے زیادہ کچھ نہ پوچھنا، کیونکہ مصیبت کا ذکر، مصیبت کو قریب کر دیتا ہے، جس طرح موت کا خوف، موت کو قریب کر دیتا ہے۔"

میرے دوست نے اپنا منہ پھیر لیا اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا، گویا فضائے بسیط میں دن اور رات کے بھیدوں کا کھوج لگا رہا ہے۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا، اور اپنے دوست سے رخصتی مصافحہ کے وقت میں نے کہا:۔

"میں کل فارسس کرامہ سے ملنے جاؤں گا، اپنے وعدہ کی تکمیل اور اس سرگزشت کا احترام کرتے ہوئے، جسے میرے والد کی محبت نے اس کے دل سے ہنوز فراموش نہیں ہونے دیا"

نوجوان کا رنگ فق ہو گیا، خد و خال متغیر ہو گئے، گویا میرے ان مختصر کلمات نے اس کے لئے ایک نئی اور ہولناک فکر پیدا کر دی۔ اس نے مجھ پر ایک طویل اور عجیب نگاہ ڈالی ... محبت شفقت اور خوف کی ملی جلی نگاہ وہ پیغمبرانہ نگاہ، جو روح کی گہرائیوں میں اس چیز کو دیکھ لیتی ہے، جس سے خود روح بھی ناواقف ہوتی ہے۔ اس کے ہونٹ مرتعش ہوئے! لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکا۔

اپنے دوست کو اسی حال میں چھوڑ کر، اپنے تباہ شدہ افکار میں گم، میں دروازہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، اس کی دونوں آنکھیں اسی عجیب نگاہ کے ساتھ، میرا تعاقب کر رہی تھیں...... وہ نگاہ جس کا مفہوم اس وقت تک میری سمجھ میں نہیں آیا، جب تک کہ میری روح، اس مادی دنیا سے، ملاء اعلیٰ کی ان مسرت گاہوں کی طرف پرواز نہ کر گئی، جہاں دل نگاہوں کے ذریعے ملتے، اور روحیں، محبت کی آغوش میں پروان چڑھتی ہیں۔

(۴)

ہیکل کے دروازہ میں

کچھ دنوں کے بعد جبکہ میرا دل تنہائی سے اکتا گیا تھا، اور میری آنکھیں خشک کتابوں کے مطالعہ سے تھک گئی تھیں، میں فارس کرامہ کے ملنے جانے کے لئے گاڑی میں سوار ہوا۔ صنوبر کے جنگل کے قریب پہنچکر، جہاں اہل بیروت سیر و تفریح کے لیے آتے ہیں، کوچوان نے گھوڑوں کی باگ، شارع عام سے ایک ایسی سڑک کی طرف موڑ دی، جس پر بید کے درخت سایہ فگن تھے، اور دونوں طرف چھوٹے چھوٹے پودے اور جھاڑیاں، انگور کی بیلیں اور یاقوتی زمردیں اور طلائی رنگ کے پھول ہوا میں لہلہا رہے تھے۔

گاڑی ایک کوٹھی کے قریب پہونچ کر رکی، جس کے چاروں طرف باغ تھا جہاں درختوں کی شاخیں ایک دوسرے سے گلے مل رہی تھیں اور فضا گلاب اور چنبیلی کے پھولوں سے بس رہی تھی۔

میں چند ہی قدم چلا تھا کہ فارس کرامہ مجھے خوش آمدید کہنے کے لئے

کوٹھی کے دروازہ سے نکلتا نظر آیا، شاید گھوڑوں کی ٹاپ نے اسے میرے آنے کی اطلاع دے دی تھی .... مجھے دیکھ کر وہ بہت مسرور ہوا، اور خوشی خوشی کوٹھی میں لے گیا۔ ایک مشتاق باپ کی طرح، اس نے مجھے اپنے پہلو میں بٹھایا اور مجھ سے میرے حالاتِ ماضی معلوم کرنے لگا۔ جب اس نے میرے مستقبل کے ارادے معلوم کرنے چاہے تو میں نے ایک ایسے نغمہ آگیں لہجہ میں جواب دیا، جو خوابوں اور موہوم آرزوؤں کی دنیا سے تعلق رکھتا ہے، وہ مترنم لہجہ، جو ہر نوجوان کی زندگی کا اس وقت تک جزوِ لازم ہوتا ہے جب تک خیال و تصور کی موجیں، جد و جہد کے لئے اُسے ساحلِ عمل پر نہ پھینکیں، جوانی کے بازو، جن کے پر، نازک احساسات اور اعصاب، لطیف خیالات سے مرکب ہیں، نوجوانوں کو بادلوں سے پرے اڑائے جاتے ہیں۔ جہاں سے کائنات، قوسِ قزح کی رنگینیوں میں ڈوبی، اور زندگی عظمت و بزرگی کے گیت گاتی نظر آتی ہے۔

لیکن یہ نرم و لطیف بازو، طوفانِ باد کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر، حقیقت کی دنیا میں گر پڑتے ہیں .... اور حقیقت کی دنیا، ایک انوکھا آئینہ ہے جس میں روح، بے حقیقت اور شکل، بگڑی ہوئی نظر آتی ہے۔

اس وقت، دروازہ کے ریشمی پردہ کے پیچھے سے، ایک حسین لڑکی سفید ریشم کا قیمتی لباس پہنے نمودار ہوئی۔ میں استقبال کے لئے کھڑا ہو گیا میرے ساتھ فارس کرامہ بھی کھڑا ہوا، اور بطورِ تعارف کہا:

"یہ میری لڑکی سلمٰی ہے!"

پھر اُسے میرا نام بتا کر کہا:۔

"میرا پرانا دوست، جسے زمانے نے میری نگاہوں سے چھپا دیا تھا، اپنے بیٹے کے روپ میں میرے سامنے ہے۔ اس وقت میں اُسے دیکھ بھی رہا ہوں۔ اور نہیں بھی دیکھ رہا!"

لڑکی میری طرف بڑھی اور اپنی نگاہیں میرے چہرہ پر اس طرح گاڑ دیں گویا میری آنکھوں سے میری حقیقت حال دریافت کرنا چاہتی ہے، معلوم کرنا چاہتی ہے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟

پھر اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا، جو نزاکت اور سفیدی میں چنبیلی کے پھول سے مشابہ تھا۔

ہاتھ ملاتے وقت، جب اس کی ہتھیلی، میری ہتھیلی سے مس ہوئی، تو میں نے ایک ایسی عجیب اور نئی کیفیت محسوس کی، جیسے شاعرانہ فکر، وجود پذیر ہوتے وقت، شاعر کی تخئیل میں ہو۔

ہم سب خاموش بیٹھے تھے، معلوم ہوتا تھا سلمیٰ اپنے ہمراہ ایک سادی روح کمرہ میں لے کر آئی ہے، جس نے فضا پر سکون وجلال طاری کر دیا ہے وہ میری طرف متوجہ ہوئی اس طرح، گویا اس نے میری تمام نفسی کیفیات کو سمجھ لیا ہے، اور مسکرا کر کہنے لگی:۔

"ابا جان نے اپنی داستان شباب کے دوران میں اکثر آپ کے والد کا ذکر کیا ہے۔ اور چونکہ ان واقعات کی بنا پر، میں آپ کے والد کو جانتی ہوں اس لئے میرے خیال میں، ہماری یہ ملاقات، پہلی ملاقات نہیں کہی جا سکتی

فادر سن کرامہ اپنی بیٹی کے ان الفاظ سے بہت خوش ہوا، باچھیں کھل گئیں پھر اس نے کہا،

"سلمیٰ جذباتی اور مذہبی خیال کی لڑکی ہے، اس لئے اسے ہر چیز فضائے رُوح میں تیرتی نظر آتی ہے"

اب فادر سن کرامہ نے پورے اہتمام اور انتہائی ہمدردی کے ساتھ میرے حالات بیان کرنے شروع کئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے میری ذات میں کوئی پُر فسوں راز پالیا ہے، جو اُسے یاد کے بازوؤں پر بٹھا کر ماضی کے دل فریب زمانہ کی طرف لئے جارہا ہے۔

فادر سن کرامہ مجھ پر لگاہیں جمائے، اپنی جوانی کے دھندلکوں کی طرف لوٹنا چاہتا تھا۔ اور میں دنیا و مافیہا سے غافل، مستقبل کے خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ میری طرف اس طرح دیکھ رہا تھا۔ جیسے موسمی پھلوں سے لدے پھندے بلند و بالا درخت کی ٹہنیاں اس چھوٹے سے پودے پر سایہ فگن ہوں، جس کے ارادے نا تجربہ کارانہ اور زندگی نشیب و فراز سے ناواقف ہو ......

وہ پرانا درخت، جس کی جڑیں مضبوط ہوں، جس نے زمانے کے گرم و سرد کا، تجربہ حاصل کیا ہو اور جو آندھیوں اور طوفانوں کے سامنے کھڑا ہو۔ اور وہ نرم و نازک پودا، جس نے بہار کے سوا کچھ نہ دیکھا ہو، اور جو نسیم سحر کی ہلکی اور خوشگوار موجوں کے سوا، نہ لہلہایا ہو۔

لیکن سلمیٰ ــــ وہ خاموش بیٹھی، کبھی مجھے دیکھتی تھی اور کبھی اپنے والد کو۔ گویا ہم دونوں کے چہرے ایک کتاب کے دو صفحے تھے جن میں وہ

"سرگزشت زندگی" کا پہلا اور آخری باب پڑھ رہی تھی۔

دن، اُن چاردیواریوں اور باغوں سے ٹھنڈے سانس بھرتا ہوا گزر گیا۔ اور آفتاب لبنان کی ان بلند چوٹیوں پر جو اس کوٹھی کے بالکل سامنے تھیں، اپنے بوسہ کا زرد نشان چھوڑ کر غائب ہو گیا۔

فارس کرامہ اپنے واقعات سے مجھے حیرت میں ڈال رہا تھا۔ اور میں اپنے نغمہ ہائے شباب سنا کر اسے خوش کر رہا تھا۔ لیکن سلمیٰ، کھڑکی کے قریب ساکت و صامت بیٹھی ہم دونوں کو غمگین نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، وہ ہماری باتیں خاموشی سے سن رہی تھی، گویا جانتی ہے کہ "حسن" کے لیے ایک آسمانی زبان ہے، جو اُن آوازوں اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں سے کہیں بلند ہے، جنہیں ہماری زبانیں اور ہونٹ ادا کرتے ہیں، وہ غیر فانی زبان، جو تمام انسانی نغموں کو خود میں جذب کر کے ایک خاموش احساس بنا دیتی ہے۔ جس طرح خاموش سمندر، ندی نالوں کے گیتوں کو اپنی گہرائیوں میں جذب کر کے ایک ابدی سکوت میں تبدیل کر دیتا ہے۔

حسن، ایک راز ہے، جسے معلوم کر کے ہماری روحیں فرحت حاصل کرتی اور اس کی تاثیروں سے پروان چڑھتی ہیں۔ لیکن ہمارے افکار و تصورات، اس کے مقابل درماندہ ہوتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح اسے الفاظ کا جامہ پہنائیں۔ لیکن ناکام رہتے ہیں

حسن، ایک موج ہے جو چشمہ سے ابھر کر ناظر کے جذبات اور منظور کی حقیقت کے درمیان جنباں ہوتی ہے۔"

حقیقی حسن وہ شعاعیں ہیں، جو ہماری روح کے مقدس ترین سرچشمہ سے پھوٹ کر ہمارے جسم ظاہری کو روشن کر دیتی ہیں، جس طرح بیج کی گہرائیوں سے زندگی پھوٹتی ہے۔ اور پھول رنگ و بو حاصل کرتے ہیں وہ مرد اور عورت کے درمیان ایک مکمل سمجھوتہ ہے۔ جو ایک لمحہ میں تکمیل کو پہونچ جاتا اور اسی لمحہ ایک ایسا میلان پیدا کر دیتا ہے، جو تمام میلانات سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ روح کا یہی میلان ہے، جسے ہم محبت کہتے ہیں۔

تو کیا، اس دن شام کو میری روح نے سلمیٰ کی روح کو سمجھ لیا تھا؟ کیا یہ اسی مفاہمت کا اثر تھا کہ میں نے سلمیٰ کو دنیا کی سب سے حسین عورت پایا تھا؟ کیا یہی نشۂ جوانی تھا، جس نے ہمیں اُن دھندلے نقوش کے تصورات میں الجھا دیا تھا، جن کی کوئی حقیقت نہ تھی؟ کیا جوانی نے مجھے اندھا کر دیا تھا، کہ میں سلمیٰ کی آنکھوں میں شعاعیں اس کے قد میں نزاکت اور اس کے سراپا میں حلاوت ہونے کا گمان کر رہا تھا؟ کیا یہی شعاعیں یہی نزاکت اور یہی حلاوت تھی، جنہوں نے محبت کی شادمانیوں اور غم انگیزیوں کا تماشا دکھانے کے لیے، میری آنکھیں کھولیں؟

مجھے کچھ معلوم نہیں، لیکن اتنا جانتا ہوں کہ وہ جذبہ، جو میں نے اس وقت محسوس کیا، اس سے پہلے کبھی محسوس نہ کیا تھا .... وہ جذبہ جو میرے دل کے گرد آہستہ آہستہ گھوم رہا تھا، جس طرح آغاز حیات سے پہلے، روح، اتھاہ سمندر پر اُڑ رہی تھی۔ اسی جذبہ سے میری سعادت اور بدبختی پیدا ہوئی۔ جس طرح اسی روح کے ارادہ سے کائنات، پکے

بعد دیکھے وجود میں آئی۔

اس طرح گزارہ وقت، جس نے مجھے اور سلمیٰ کو پہلی بار ایک جگہ اکٹھا کیا تھا۔ اور یہ ہوئی مشیت الٰہی کہ اس نے غیر محسوس طور پر مجھے سرگشتگی وبے پروائی کی جکڑبندیوں سے آزاد کر دیا۔ تاکہ میں آزادانہ طور پر محبت کے جلوس کے ساتھ ساتھ چل سکوں

اس دنیا میں، صرف محبت ہی وہ آزادی ہے، جو روح کو اس بلند مقام پر پہونچا دیتی ہے، جہاں انسانی قانون ورواج نہیں پہونچا سکتے۔ اور جہاں مادی احکام وضوابط کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔

جب میں رخصت ہونے کے لئے کھڑا ہوا، تو فارس کرامہ میرے قریب آیا اور پُرخلوص لہجہ میں کہنے لگا۔

"اب کہ تمہیں اس گھر کا راستہ معلوم ہو گیا ہے مجھے امید ہے کہ تم اسے اپنا گھر سمجھ کر آتے رہوگے اور یہ کہ مجھے اپنے باپ اور سلمیٰ کو اپنی بہن کی طرح سمجھو گے۔ کیوں سلمیٰ، میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

سلمیٰ نے اثبات میں اپنا سر ہلایا اور میری طرف دیکھا، اس گم کردہ راہ مسافر کی طرح جسے کوئی اپنا جانا پہچانا ہم مذاق مل جائے۔

فارس کرامہ کے الفاظ، جو اس نے میرے متعلق کہے، نغمۂ اولین تھے، جس نے محبت کے دربار میں مجھے اس کی بیٹی کے پہلو بہ پہلو کھڑا کر دیا آسمانی گیتوں کی بارش تھے، جو نوحہ وماتم پر ختم ہوتے ہیں! ایک قوت تھے جس نے ہماری روحوں کے حوصلے بڑھا کر ہمیں نور و نار سے قریب کر دیا۔

اور ایک ساغر تھے، جس میں ہم نے مئے کوثر بھی پی اور آبِ اندرائن بھی!

میں کوٹھی سے نکلا، خارس کرامہ اور سلمیٰ مجھے باغ کی چار دیواری تک چھوڑنے آئے، میں نے ان دونوں کو الوداع کہا۔ میرا دل سینے میں دھڑک رہا تھا جس طرح پیاسے ہونٹ پانی کے گلاس سے مس ہوتے وقت پھڑکتے ہیں۔

I Love You WASIM

(۵)

سفید شعلہ

اپریل کا مہینہ ختم ہو گیا۔ اس دوران میں میں برابر فارس کرامہ کے ہاں جاتا اور سلمیٰ سے شرف ملاقات حاصل کرتا رہا۔ ہم دونوں باتیں کرتے کرتے، باغ کے کسی گوشہ میں چلے جاتے، جہاں میں سلمیٰ کے سامنے بیٹھ کر، اس کی خوبیوں پر غور کرتا اسکی فطری صلاحیتوں پر دل ہی دل میں متعجب ہوتا!! اس کے غمِ خاموش، کی فریاد سنتا، اور ان مخفی ہاتھوں کا وجود محسوس کرتا، جو مجھے بے اختیار اس کی طرف گھسیٹتے تھے۔ سلمیٰ کی ہر ملاقات، اس کے حسن و جمال کی ایک نئی لطافت اور اس کی روح کا ایک گہرا راز مجھ پر منکشف کرتی، یہاں تک کہ اس کا وجود میرے لیئے ایک کتاب ہو گیا۔ جس کی عبارتیں میں لفظ بہ لفظ پڑھتا۔ اور زبانی یاد کرتا تھا جس کے گیت میں بار بار.. گن گناتا تھا۔ لیکن جسے ختم کرنا، میرے امکان سے باہر تھا،

وہ عورت، جسے فطرت نے، حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت بھی عطا کیا ہو

ایک کھلی ہوئی مگرنازک حقیقت ہے، جسے ہم محبت کے ذریعہ سمجھ سکتے اور پاکیزگی کے ذریعہ چھو بھی سکتے ہیں، لیکن اگر ہم چاہیں کہ اس حقیقت کو الفاظ میں بیان کریں، تو وہ حیرت واشتباہ کی کہر میں چھُپ کر، ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جائے گی۔

سلمیٰ بھی چونکہ ظاہری اور باطنی محاسن کا پیکر لطیف تھی، اس لئے کیسے ممکن ہو سکتا ہے، کہ میں ایک ایسے شخص کے سامنے اس کی خوبیاں بیان کروں، جو اسے نہیں جانتا! کیا موت کے سائے میں بیٹھا ہوا انسان، بلبل کے نغموں، پھولوں کی سرگوشیوں اور ندی کے راگوں کو یاد رکھ سکتا ہے؟ کیا بھاری زنجیر دل میں جکڑا ہوا قیدی، نسیم سحر کی موجوں کے ساتھ دوڑ سکتا ہے؟

لیکن کیا خاموشی، گفتگو سے زیادہ سنگین نہیں ہوتی؟ اور اگر میں سلمیٰ کے متعلق، ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اظہار خیال کروں، تو کیا اس میں کوئی خوف میرے لئے مانع ہے، ایسی صورت میں کہ میں سنہری خطوط کے ذریعہ اس کی حقیقت کو تصویر کا جامہ نہیں پہنا سکتا؟ یقیناً بھوکا صحرا نورد، سوکھی روٹی کھانے سے انکار نہیں کرے گا، اگر آسمان سے اس کے لیے من وسلویٰ نہ اترے!

سلمیٰ دُبلے پتلے جسم کی تھی، جو سفید حریری لباس میں، ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے کھڑکی سے داخل ہوتی ہوئی چاند کی کرنیں۔ اس کی رفتار سست اور متوازن تھی جیسے اصفہانی راگ، اس کی آواز نازک اور شیریں تھی، جو ٹھنڈے سانسوں سے منقطع ہو کر اس کے قرمزی ہونٹوں سے اس طرح ٹپکتی تھی، جیسے ہوا کی موجوں سے شبنم کے قطرے پھولوں سے ٹپکیں، اور اس کا چہرہ ...... کوئی ہے جو سلمیٰ کے چہرے کی خوبیاں بیان کر سکے؟ وہ کون سے الفاظ ہیں، جن کے ذریعہ ہم ایک ایسے خاموش

اور نمگین چہرہ کی تصویر کھینچ سکیں، جب شفاف زرد رنگ کی نقاب نے چھپا بھی رکھا ہو اور نہیں بھی چھپا رکھا ہو۔ اور وہ کون سی زبان ہے، جس کے ذریعہ ہم ان خد وخال کو بیان کر سکیں، جو ہر وقت ایک مقدس مگر پرالم رُوح کے اسرار کی ترجمانی کرتے ہوں اور اپنے دیکھنے والوں کو اس روحانی دنیا کی یاد دلاتے ہوں، جو اس دنیا سے کوسوں دور ہے۔

سلمیٰ کے چہرہ کا حسن، اس کسوٹی پر نہیں کسا جا سکتا، جو انسان نے حسن کے لئے بنائی ہے۔ بلکہ وہ تو اس شیریں خواب یا اس فکر بلند سے مشابہ ہے جو حدود قیاس سے ماوراء ہے، جسے مصور کا قلم تصویر کا جامہ پہنا سکتا ہے، نہ سنگتراش کی چھینی مجسم کر سکتی ہے۔

سلمیٰ کا حسن، اس کے سنہری بالوں میں نہیں، بلکہ اس پاکیزہ ہالہ میں تھا، جو ان بالوں کے گرد محیط تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں نہیں، بلکہ اس نور میں تھا جو ان آنکھوں سے پھوٹتا تھا۔ اس کے گلابی ہونٹوں میں نہیں، بلکہ اس شیرینی میں تھا جو ان ہونٹوں سے ٹپکتی تھی۔ اس کی خم دار گردن میں نہیں، بلکہ اس کیفیت میں تھا جو اس کے ذرا آگے کی طرف گردن جھکانے سے پیدا ہوتی تھی۔

سلمیٰ کا حسن، اس کے جسم کی خوبی میں نہیں، بلکہ اس کی رُوح کی عظمت میں تھا۔۔۔۔۔۔۔ وہ روح، جو اس بھڑکتے ہوئے سفید شعلہ سے مشابہ تھی جو زمین اور لامحدود فضا کے درمیان تیر رہا ہو:

سلمیٰ کا حسن، اُن شاعرانہ نازک خیالیوں کی نوع سے تعلق رکھتا تھا جن کی پرچھائیاں ہمیں سامی قصیدوں، غیر فانی گیتوں اور تصویروں میں نظر آتی ہیں۔ لیکن نازک خیال شاعر اور مصور بد قسمت ہیں کہ وہ خود اور ان کی تمام روحانی ..

عظمتیں، آنسوؤں کے غلاف میں لپٹی رہتی ہیں۔

سلمیٰ سوچتی زیادہ تھی۔ اور بولتی کم تھی، لیکن اس کی خاموشی میں بھی، ایک سی کیفیت تھی، جو اس کے پاس بیٹھنے والے کو، خوابوں کی دور دراز نزہت گاہوں میں لے جاتی تھی، اور اسے اس قابل بنا دیتی تھی کہ وہ اس کے دل کی دھڑکنوں کو سن سکے، اور اس کے خیالات و جذبات کو اپنی آنکھوں کے سامنے گردش کرتے دیکھ سکے۔

لیکن سب سے بڑی خوبی، جس نے سلمیٰ کے اخلاق و فضائل کو چار چاند لگائے اس کا بے پناہ اور جراحت کار غم تھا، یہ غم ایک ردائے لطیف تھا، جیسے اوڑھنے کے بعد، سلمیٰ کے جسمانی محاسن میں جلال و اعجوبگی کا اضافہ ہو گیا۔ اور اس چادر کی بناوٹ میں سے اس کی روح کی شعاعیں، اس طرح جھلکنے لگیں۔ جیسے صبح کی لطیف کہر کے پیچھے سے، پھولوں سے لدے پھندے درختوں کی ٹہنیاں! یہی غم تھا، جس نے میری اور سلمیٰ کی روح کے درمیان، رشتہ مشابہت پیدا کر دیا، اور ہم میں سے ہر ایک، اپنے دل کے محسوسات کا اثر، دوسرے کے چہرہ سے نمایاں دیکھنے اور اپنے سینہ کی گھٹی ہوئی فریادوں کی گونج، دوسرے کی آواز میں سننے لگا۔

گویا فطرت نے، ہم میں سے ہر ایک کو، دوسرے کا نصف آخر بنا دیا تھا، کہ جب ایک ٹکڑا دوسرے سے، پاکیزگی کے ذریعہ، ملتا تو انسان کامل ہو جاتا، اور جدا ہوتا تو اپنی روح میں ایک دردناک کمی محسوس کرتا،

غمگین و اداس روح، دوسری روح سے مل کر جو شعور میں اس سے ملتی

جلتی اور احساس میں اس کی شریک ہو، راحت پائی ہے، جس طرح، ایک پردیسی اپنے وطن سے کوسوں دُور، دوسرے ہم وطن پردیسی سے مل کر خوش ہوتا ہے؛ اس لئے وہ دل، جنہیں غم کے روگ نے ایک دوسرے سے قریب کردیا ہو، لطف و مسرت کی شادمانیوں سے جدا ہو سکتے ہیں، نہ عیش و نشاط کی غوغا آرائیوں سے! کیونکہ غم کا رابطہ، دو رُوحوں میں، عشرت و راحت کے رابطے سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔ اور وہ محبت، جسے آنکھوں نے، اپنے آنسوؤں سے غسل دیا ہو، ہمیشہ کے لئے پاک، حسین اور قائم ہو جاتی ہے۔

(٦)

طوفان

کچھ دنوں بعد، فارس کرامہ نے مجھے اپنے گھر، رات کے کھانے پر بلایا، اور میں گیا، میری روح، اس مقدس روٹی کی بھوکی تھی، جو فطرت کی طرف سے سلمیٰ کے ہاتھوں کی زینت بنائی گئی تھی .... وہ ملکوتی روٹی، جسے ہم دل اور روح سے کھاتے ہیں اور ہماری بھوک میں اضافہ ہو جاتا ہے .... وہ سیمیائی روٹی، جس کا مزہ، عرب کے قیسؔ، اطالیہ کے دینتےؔ اور یونان کی سیفوؔ نے چکھا۔ اور ان کے تن من بھڑک اٹھے .... وہ روٹی، جس کا خمیر، فطرت نے بوسوں کی شیرینی اور آنسوؤں کی تلخی سے کیا۔ اور اسے بیدار و حساس روحوں کی غذا بنا دیا تاکہ وہ اس کے مزے سے فرحت حاصل کریں اور اس کی تاثیر سے مبتلائے عذاب ہوں

کوٹھی پر پہونچ کر میں نے دیکھا کہ سلمیٰ، باغ کے ایک گوشہ میں، لکڑی کی بنچ پر، اپنا سر ایک درخت کے تنے پر ٹکائے بیٹھی ہے۔ سفید لباس میں وہ ایسی معلوم

ہو رہی تھی، گویا خیال کی پری ہے، جو اس جگہ کی نگہبانی کر رہی ہے۔ میں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا۔ اور اس کے قریب اس طرح بیٹھ گیا جیسے مرعوب آتش پرست مقدس آگ کے سامنے بیٹھتا ہے۔ جب میں نے اس سے بات کرنی چاہی تو ایسا معلوم ہوا کہ میری زبان بند ہو گئی ہے۔ اور میرے ہونٹ چپک کر رہ گئے ہیں۔ ایسی حالت میں، میں نے یہی بہتر سمجھا کہ خاموشی اختیار کروں۔ اس لیے کہ وہ احساس، جو گہرا بھی ہو، اور لامتناہی بھی، محدود الفاظ کے ذریعہ بیان ہو کر، اپنی معنوی خصوصیت کھو دیتا ہے۔ تاہم مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ سلمیٰ اس خاموشی میں میرے دل کی التجائے محبت سن رہی ہے اور کھلی آنکھوں، میری روح کی لرزتی کانپتی، پرچھائیاں دیکھ رہی ہے۔

تھوڑی دیر بعد، فارس کرامہ باغ میں آیا اور اپنی عادت کے مطابق، ہماری طرف ہاتھ پھیلائے، مجھے خوش آمدید کہتا ہوا، ہماری طرف بڑھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس طرح وہ اس مخفی راز کو مبارک باد دے رہا ہے، جس نے میری اور اسکی بیٹی کی روح کو باہم مربوط کر دیا ہے۔ ہنستے ہوئے اس نے کہا:۔

"میرے بچو! آؤ کھانا تیار ہے!!"

ہم دونوں اٹھے اور اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ سلمیٰ اپنی سرمگیں آنکھوں سے محبت اور ہمدردی کی نگاہ مجھ پر ڈال رہی تھی، گویا اس کے والد کے الفاظ "میرے بچو!" نے اس کے نفس میں ایک جدید اور شیریں جذبہ پیدا کر دیا تھا جس میں سلمیٰ کی محبت، جو اسے میری ذات سے تھی، اس طرح لپٹی ہوئی تھی، جیسے کوئی شیر خوار بچہ اپنی ماں کے سینہ سے!

ہم سب دسترخوان پر بیٹھے، کھانے پینے اور گفتگو کرنے میں مصروف تھے۔

۔۔۔۔۔۔اس کمرہ میں بیٹھے، طرح طرح کے پُر تکلف کھانوں اور مختلف قسم کی پرانی شرابوں سے لذت اندوز ہو رہے تھے، اور ہماری روحیں، ہماری لاعلمی میں، اس عالم سے دور، ایک اور عالم میں پرواز کر رہی تھیں۔ وہ مستقبل کے خواب دیکھ رہی تھیں اور اس کی تمام ہولناکیوں اور دہشت آفرینیوں کے مقابلہ کے لئے تیار تھیں۔

تین افراد، جن کے تصورات، مقاصد حیات کے اختلاف کی بناء پر مختلف اور دل، دوستی اور محبت سے رشتہ بداماں ہونے کی بناء پر متفق تھے۔

تین کمزور وبے گناہ ہستیاں، جن کے پاس احساس زیادہ اور عقل کم تھی (آہ! یہ وہ ڈرامہ ہے، جو صرف روح کی تماشاگاہ میں اسٹیج کیا جاتا ہے!!)

ایک شریف اور واجب الاحترام بوڑھا انسان، جو اپنی بیٹی سے محبت کرتا اور اس کی راحت رسانی کے سوا کچھ نہ سوچتا تھا۔

ایک بیس۲۰ سال کی حسین دوشیزہ، جو مستقبل کو کبھی اپنے سے قریب دیکھتی، کبھی دور، اور اس پر غور کرتی، یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ اس کی خوش بختی اور بدبختی کا کیا سامان اپنے میں پوشیدہ رکھتا ہے۔

اور ایک خوابوں اور دھڑکنوں کی دنیا میں رہنے بسنے والا نوجوان، جس نے ابھی تک زندگی کے ساغر میں، رنج وراحت کی شراب نہیں پی تھی، عرفان ومحبت کی فضا میں پرواز کرنے کے لئے اپنے پر تول رہا تھا، لیکن ناتوانی اسے اڑنے نہ دیتی تھی۔

تینوں، شہر سے دور، ایک تنہا مکان میں، جس پر رات کا سکوت چھایا ہوا تھا۔ اور جب آسمان کی نگاہیں تک رہی تھیں، ایک پُر تکلف دسترخوان پر بیٹھے تھے

تینوں کھانے پینے میں مشغول تھے۔ اور قضا و قدر نے ان کی رکابیوں کی گہرائی میں تلخیاں چھپا رکھی تھیں اور گلاسوں کی تہ میں، کلنٹے!

ابھی کھانا ہو ہی رہا تھا کہ ایک خادمہ کمرہ میں داخل ہوئی اور فارس کرامہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

"دروازہ پر ایک آدمی، آپ سے ملنا چاہتا ہے!"

فارس کرامہ نے فوراً سوال کیا:

"کون ہے؟"

خادمہ نے جواب دیا"

"میرے خیال میں تو پادری صاحب کا ملازم ہے!"

فارس کرامہ ایک منٹ کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے اپنی لڑکی کو اس طرح نظریں گاڑ کے دیکھا، جیسے کوئی پیغمبر، اسرار سماوی کو معلوم کرنے کیلئے آسمان کی طرف دیکھے: آخرکار وہ خادمہ کی طرف متوجہ ہوا اور کہا:۔

"اُسے آنے دو!"

خادمہ واپس ہو گئی۔ اُس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد، ایک آدمی کمرہ میں داخل ہوا، اس کا لباس سنہری کام کا تھا اور مونچھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس نے جھک کر سلام کیا۔ اور فارس کرامہ سے کہنے لگا۔

"مجھے، میرے آقا نے اپنی خاص گاڑی پر بھیجا ہے کہ میں آپ کو بلا لاؤں

انہیں آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں :"

فارس کرامہ کھڑا ہو گیا، اس کے خدوخال میں تغیر پیدا ہو گیا تھا، اور چہرہ کی بشاشت غور و فکر کے پردہ میں چھپ گئی تھی۔ وہ میرے پاس آیا۔ اور محبت بھرے لہجہ میں کہنے لگا :۔

" مجھے امید ہے کہ میری واپسی تک تم یہیں ٹھہرو گے۔ سلمیٰ تمہارے ساتھ ہوگی جس کی میٹھی میٹھی باتیں اور روحانی نغمے تمہیں رات کی اکتا دینے والی خاموشی اور تنہائی کا احساس نہ ہونے دیں گے !"

اس کے بعد وہ سلمیٰ کی طرف متوجہ ہوا، اور متبسمانہ انداز میں اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا :۔

"کیوں سلمیٰ! کیا یہ غلط ہے !!"

سلمیٰ نے اپنا سر اٹھایا، اس کے رخسار قدرے گلابی ہو گئے تھے، ایسی آواز میں، جو اپنی نزاکت کے اعتبار سے، بانسری کے نغمہ سے مشابہ تھی اس نے جواب دیا :۔

" ابا جان! میں اپنے مہمان کو خوش رکھنے کی کوشش کروں گی :

فارس کرامہ، پادری کے ملازم کے ساتھ چلا گیا۔ سلمیٰ کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی اور وہاں سے سڑک کی طرف دیکھنے لگی۔ یہاں تک کہ گاڑی تاریکی کے پردوں میں چھپ گئی۔ پہیوں کی گڑگڑاہٹ مسافت کی دوری کی وجہ سے بند اور گھوڑوں کی ٹاپ کی آواز سکون و خاموشی میں جذب ہو گئی اب سلمیٰ کھڑکی سے ہٹ کر ایک صوفہ پر بیٹھ گئی، جس پر سبز ریشمی غلاف چڑھا

ہوا تھا، اپنے سفید براق کپڑوں میں، اس سبز صوفہ پر بیٹھی ہوئی۔ وہ ایسی معلوم ہو رہی تھی، جیسے سرسبز شاخ میں سفید چنبیلی کا پھول!

اللہ کے چاند اور مجھے درختوں سے گھرے ہوئے ایک تنہا مکان میں جس پر خاموشی مسلّط تھی۔ اور جس کے چاروں طرف محبت، پاکیزگی اور حسن کے سائے متحرک تھے، سلمیٰ سے تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع مل گیا

ہم دونوں کافی دیر تک خاموش، حیران اور فکر مند بیٹھے رہے، اس انتظار میں کہ گفتگو کا آغاز دوسرے کی طرف سے ہو لیکن وہ کون سا کلام ہے جو وہ محبت کرنے والی روحوں کی مفاہمت کو بیان کر سکے، ہونٹ اور زبان سے نکلی ہوئی وہ کون سی آوازیں اور کون سے الفاظ ہیں، جو دل اور دماغ کو ایک دوسرے سے قریب کر دیں؟

تو پھر زبان کے ذریعہ ادا ہونے والے ان الفاظ سے بلند اور حلق سے نکلی ہوئی ان آوازوں سے پاکیزہ تر شے کیا ہے؟ کیا یہی خاموشی نہیں ہے جو ایک روح کی روشنی دوسری روح تک پہنچاتی ہے۔ اور ایک دل کا پیام دوسرے دل تک: کیا یہی خاموشی نہیں ہے، جو ہمیں، ہماری ذات سے جدا کر دیتی ہے اور ہم لامحدود روحانی فضاء میں، ملاء اعلیٰ کے آس پاس، اڑنے لگتے ہیں یہ جانتے ہوئے کہ ہمارے جسم مادی قید و بند سے آزاد نہیں ہیں۔

سلمیٰ نے مجھے دیکھا، اس کی آنکھیں، اس کی نفسی کیفیات کی آئینہ دار تھیں۔ پُرفسوں لہجہ میں آہستہ آہستہ اس نے کہا۔

"آؤ باغ میں چلیں، اور درختوں کے سائے میں بیٹھ کر، پہاڑوں کے

پیچھے سے چاند کو طلوع ہوتے دیکھیں!!"

تعمیل حکم کے لئے میں کھڑا تو ہو گیا، لیکن اسے، اس ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے کہا:۔

"سلمیٰ! کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ جب تک چاند طلوع ہو کر، باغ کو اپنی روشنی سے منور نہ کر دے، ہم یہیں بیٹھے رہیں۔ اس وقت تو تاریکی نے درختوں اور پھولوں کو چھپا رکھا ہے، ہم وہاں جا کر دیکھیں گے کیا؟"

اُس نے جواب دیا۔

"تاریکی، درختوں اور پھولوں کو ہماری نگاہوں سے چھپا سکتی ہے لیکن محبت کو ہماری روح سے نہیں چھپا سکتی"

یہ فقرے اس نے ایک عجیب لہجہ میں کہے اور پھر اپنی نگاہیں پھیر کر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔ میں خاموش بیٹھا، اس کے فقروں پر غور کر رہا تھا۔۔۔۔ اس کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کے معنی سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا اور ہر معنی کو حقیقت کا لباس پہنا رہا تھا!! سلمیٰ دوبارہ میری طرف متوجہ ہوئی اور اپنی نگاہیں میرے چہرہ پر جما دیں، گویا اپنے کہے پر نادم ہے۔ اس نے چاہا کہ اپنی آنکھوں کی سحر طرازی سے کام لے کر اپنے الفاظ، میرے کانوں سے نکال لے۔ لیکن اس کی آنکھوں کا جادو، اُن الفاظ کو میرے کانوں سے نکال نہ سکا بلکہ اس نے تو اُن الفاظ میں زیادہ اثر و وضاحت پیدا کر کے انہیں میرے سینہ کی گہرائیوں میں پہونچا دیا، تاکہ وہ اپنی زندگی کے آخری سانس تک میرے دل سے چمٹے رہیں اور میرے جذبات کے ساتھ موجزن ہوں۔

دنیا کی ہر بڑی اور حسین شے فکر واحد سے پیدا ہوئی ہے یا حاشۂ باطنی سے۔ ہر وہ چیز، جسے آج ہم دیکھتے ہیں اور جو زمانہ کی مسلسل گردشوں کے نتیجہ میں ہمیں حاصل ہوتی ہے، اپنے ظہور سے پہلے، مرد کے دماغ کا مخفی فکر ہوتی ہے یا عورت کے سینہ کا لطیف جذبہ!........ وہ خوفناک ہنگامے، جن میں انسانی خون ندی نالوں کی طرح بہتا ہے۔ اور آزادی کی پرستش، دیوی دیوتاؤں کی طرح کی جاتی ہے ان میں سے ہر ہنگامہ ابتداءً ایک دھندلا سا تصور ہوتا ہے، جو عام آدمیوں میں رہنے بسنے والے ایک آدمی کے دماغی گوشوں میں لرزتا ہے۔ وہ دردناک لڑائیاں، جن میں تخت وتاج خاک میں ملجاتے ہیں، اور صاحبان تخت وتاج، خانماں برباد ہوجاتے ہیں، ان میں سے ہر لڑائی اول اول ایک خیال ہوتی ہے، جو کسی فرد کے سر میں چکر لگاتا ہے۔ وہ اعلیٰ التعلیم، جو انسانی زندگی کا خط سفر بدل دیتی ہے، شروع میں صرف ایک شاعرانہ میلان ہوتی ہے، جو کسی فرد واحد کے افکار کے ساتھ، اس کی ذات سے علیحدہ ہوجاتا ہے۔ ایک تصور اہرام مصر کی تعمیر کرتا ہے، اور ایک جذبہ ان کی بنیادیں ہلا ڈالتا ہے۔ ایک خیال اسلام جیسے مقدس مذہب کی تخلیق کرتا ہے اور ایک کلمہ، کتب خانہ اسکندریہ کو جلا کر خاک کر دیتا ہے۔

ایک تصور تمہیں سکوت شب کے رستے پر ڈال کر عظمت وبزرگی کے راحت کدہ میں پہنچا دیتا ہے، یا جنون ودیوانگی کے حیرت زار میں۔ عورت کی ایک نگاہ، تمہیں دنیا کا سب سے زیادہ خوش قسمت انسان بنا دیتی ہے، یا سب سے زیادہ بدقسمت۔ کسی مرد کے ہونٹوں سے نکلا ہوا ایک کلمہ تمہیں غربت د

ومحتاجی کے بعد امارت و بے فکری کے درجہ پر پہنچا دیتا ہے یا امارت و بے فکری کے بعد غربت ومحتاجی کے درجہ پر۔

ایک لفظ نے، جو اس خاموش پر فسوں رات کو سلمیٰ کے ہونٹوں سے نکلا تھا، مجھے میرے ماضی اور مستقبل کے درمیان، اس طرح کھڑا کر دیا، جیسے فضاء کے طبقات اور سمندر کے بھنور کے درمیان کشتی! اس ایک لطیف کلمہ نے، مجھے جوانی اور بے فکری کی گہری نیند سے بیدار کر کے، ایک ایسے نئے راستہ پر لا ڈالا، جو محبت کی ان نزہت گاہوں کی طرف جاتا تھا، جہاں زندگی اور موت دامن اور گریباں تھیں۔

ہم دونوں باغ میں گئے اور درختوں کے درمیان ٹہلنے لگے، ٹھنڈی ہوا کی مخفی انگلیاں ہمارے چہروں کو مس کر رہی تھیں، اور پھولوں سے لدی ہوئی بیلیں اور نرم و نازک گھاس ہمارے پاؤں میں لہرا رہی تھی۔ چنبیلی کے درخت کے پاس پہونچکر، ہم دونوں اسی لکڑی کی بنچ پر خاموش بیٹھ گئے، جہاں کھانا کھانے سے پیشتر بیٹھے تھے۔ ہم فطرت کو سانس لیتے سُن رہے تھے اور اپنے ٹھنڈے سانسوں کی شیرینی کے ذریعہ، آسمان کی آنکھوں کے سامنے، جو ہمیں نیلگوں فضا کے پیچھے سے تک رہی تھیں، اپنے سینوں کے ڈھکے چھپے راز منکشف کر رہے تھے۔

چاند صنین کے پیچھے سے طلوع ہوا۔ اس کی روشنی سے ساری فضا منور ہو گئی چاندنی میں وادیوں کے آس پاس کی آبادیاں ایسی معلوم ہونے لگیں، گویا وہ شمعیں ہیں۔ جو کسی موہوم جگہ سے پھوٹ رہی ہیں۔ چاندنی کی سیمیں شعاعوں میں سارا لبنان ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے کوئی نوجوان، لطیف نقاب ڈالے، جو

اس کے اعضاء کی پردہ پوشی کر بھی رہی ہو، اور نہیں بھی کر رہی ہو، اپنے بازو کے سہارے بیٹھا ہے

لبنان، مغربی شاعروں کے نزدیک ایک خیالی مقام ہے، جس کی حقیقت داؤدؑ سلیمانؑ اور دوسرے پیغمبروں کے گذر جانے سے ختم ہو گئی، جس طرح جنت آدمؑ حواؑ کے نکال دیئے جانے سے روپوش ہو گئی، حالانکہ وہ ایک شاعرانہ لفظ ہی جس کی حقیقت گمنام ہے۔ وہ لفظ، جو روحانی جذبہ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور فکر کے سامنے، صنوبر اور دیودار کے ان سبزہ زاروں کی تصویریں پیش کرتا ہے، جہاں سے عطر و لوبان کی مہک آتی ہے۔ پیتل اور سنگ مرمر کے ان برجوں کی یاد تازہ کرتا ہے، جو عظمت و بزرگی کے ساتھ سر بلند ہیں اور ان ہرنوں کی ڈاروں کا تصور عرض نظر کرتا ہے، جو وادیوں اور کھنڈروں میں چوکڑیاں بھرتے پھرتے ہیں۔ میں نے خود اس رات کو دیکھا ہے کہ لبنان، لطیف شاعرانہ فکر کی مثال، اس طرح میری نگاہوں کے سامنے تھا، جیسے دو بیداریوں کے درمیان خواب۔

ہم جذبات کے تغیر کے ساتھ ساتھ، ماحول کو اپنی نگاہوں کے سامنے متغیر ہوتے دیکھ رہے تھے۔ اور فضاء کو سحر و جمال کی نقاب ڈالے محسوس کر رہے تھے۔ حالانکہ سحر و جمال ہماری ذات سے علیحدہ، کچھ نہ تھا۔

سلمیٰ میری طرف متوجہ ہوئی، چاند کی شعاعیں اس کے چہرہ، گردن اور کلائیوں پر اس طرح لوٹ رہی تھیں کہ وہ ہاتھی دانت کی مورتی معلوم ہوتی تھی جسے کسی خدا پرست کی انگلیوں نے، حسن و محبت کی دیوی، عشتروت کے لئے تراشا ہو، وہ کہنے لگی:۔

"تم بات کیوں نہیں کرتے؟ مجھے اپنے گذرے ہوئے زمانہ کے حالات کیوں نہیں سناتے؟"

میں نے اس کی روشن آنکھوں کی طرف دیکھا، اور اس گونگے کی طرح، جسے ابھی قوت گویائی ملی ہو، جواب دیا:۔

"کیا اس جگہ آنے کے بعد، جو گفتگو میں نے کی ہے، تم نے نہیں سنی؟ کیا باغ میں داخل ہونے کے بعد، جو کچھ میں نے کہا، تمہارے کانوں تک نہیں پہنچا سلمیٰ! تمہاری روح، جو پھولوں کی سرگوشیاں اور خاموشی کے نغمے سنتی ہے، میری روح کی پکار اور میرے دل کی فریاد بھی سن سکتی ہے!!

اس نے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور رک رک کر کہنے لگی:۔

"میں نے سن لیا...... ہاں! میں نے سب کچھ سن لیا!!...... رات کے حلق سے نکلتی ہوئی پکار بھی سن لی اور دن کے سینہ سے اُبلتی ہوئی فریاد بھی!!!"

یہ سن کر میں اپنے ماضی کو بھول گیا، اپنے وجود کو بھول گیا، ہر چیز کو بھول گیا اب میں سلمیٰ کے سوا کسی کو نہ جانتا تھا۔ اس کے وجود کے سوا کسی چیز کا احساس مجھ میں باقی نہ رہا تھا۔ جلدی سے میں نے کہا:۔

"سلمیٰ! میں نے بھی تمہارے دل کا حال سن لیا!!......... میں نے بھی وہ نغمۂ بزرگ سن لیا، جو حیات آفریں بھی ہے اور دشمن حیات بھی! جس کے زیر و بم سے فضا ہم آہنگ ہے اور جس کی لرزش سے زمین کی بنیادیں ہل جاتی ہیں:

سلمیٰ نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور اس کے قرمزی ہونٹوں پر ایک ہلکا سا، غمگین تبسم نمودار ہوا۔ سرگوشی کے لہجہ میں اس نے کہا:۔

"مجھے اب معلوم ہوا کہ دنیا میں ایک ایسی شے بھی پائی جاتی ہے، جو آسمان سے زیادہ بلند، سمندر سے زیادہ گہری اور زندگی، موت اور زمانہ سے زیادہ قوی ہے۔ آج مجھے وہ بات معلوم ہوگئی، جو کل تک میں نہ جانتی تھی۔ جسے میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا"

اسی لمحہ سے سلمیٰ مجھے دوست سے زیادہ عزیز، بہن سے زیادہ قریب اور محبوبہ سے زیادہ محبوبہ ہوگئی۔ وہ میرے لیے ایک بلند تصور ہوگئی، جس کی پیروی کرنے پر میری عقل مجبور تھی، ایک نازک احساس ہوگئی، جس نے میرے دل کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ایک حسین خواب ہوگئی، جس نے میری روح کو اپنا... کاشانہ بنا لیا

کس قدر نادان ہیں وہ لوگ، جو سمجھتے ہیں کہ محبت، مدتوں ساتھ رہنے سہنے اور مسلسل دوستی کے بعد پیدا ہوتی ہے، اس لیے کہ حقیقی محبت، دو روحوں کے باہمی ملاپ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اور اگر یہ میل ملاپ ایک لمحہ میں مکمل نہ ہو تو پھر اس کی تکمیل ایک سال میں ہو سکتی ہے نہ ایک صدی میں۔

سلمیٰ نے اپنا سر اونچا کیا اور وہ افق کی طرف دیکھنے لگی۔ جہاں آسمان کا دامن فضا کے دامن سے بندھا ہوا تھا۔ اس نے کہا:

"کل تک تم میرے بھائی تھے، جس کے پاس میں مطمئن ہو کر آتی اور اپنے والد کے سایہ میں اس کے پہلو میں بیٹھ جاتی، لیکن اب میں ایک ایسی شے کا وجود

محسوس کر رہی ہوں، جو بھائی بندی کے علاقہ سے کہیں زیادہ قوی اور شیریں ہے، ایک عجیب جذبہ محسوس کر رہی ہوں، جو ہر تعلق سے آزاد ہے ...... وہ جذبہ جو قوی بھی ہے۔ اور گہرا بھی، ڈراؤنا بھی ہے اور خوشگوار بھی ...... وہ جذبہ، جو میرے دل کو غم اور خوشی سے نواز رہا ہے"

میں نے جواب دیا۔

"کیا یہ جذبہ، جس سے ہم خوف زدہ ہوتے ہیں اور جو ہمارے ... سے گزرتا ہے۔ تو ہم کانپ اٹھتے ہیں، ناموس فطرت کا ایک جزو نہیں ہے ...... ناموس فطرت جس کے ماتحت، چاند زمین کے گرد چکر لگاتا ہے، زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور سورج، مع اپنے متعلقات کے، ذات خداوندی کا طواف کرتا"

اس نے اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھا اور انگلیاں میرے بالوں میں پیوست کر دیں۔ اس کا چہرہ غم کی تصویر تھا۔ اور پلکوں پر آنسو اس طرح چمک رہے جیسے نرگس کی پتیوں کے کنارہ پر شبنم کے قطرے! اس نے کہا:

"کرۂ ارض پر رہنے بسنے والوں میں کون ہے، جو ہماری داستان کی تصدیق کر سکے؟ کون ہے، جو اس بات کو صحیح مان سکے کہ غروب آفتاب اور طلوع ماہ کی درمیانی ساعت میں، تمام علائق سے بے نیاز ہو کر، ہم نے شک اور یقین کے درمیانی راستے طے کر لیے؟ کون ہے، جو یقین کر سکے کہ اپریل کا مہینہ، جس میں ہم دونوں پہلی مرتبہ ایک دوسرے آشنا ہوئے، وہ مہینہ تھا، جس نے ہمیں زندگی کے مقدس ترین مرکز پر پہونچا دیا؟"

اس کا ہاتھ اب بھی میرے جھکے ہوئے سر پر تھا۔ اس وقت، وہ ترجمہ

و نازک ہاتھ، جو میرے بالوں سے کھیل رہا تھا، مجھے شاہانہ تاج سے کہیں زیادہ عزیز تھا۔ میں نے جواب دیا۔

"لوگ ہماری داستانِ محبت کو صحیح نہیں سمجھ سکتے کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ صرف محبت ہی وہ پھول ہے، جو اپنی نشوونما کے لیے کسی موسم کا محتاج نہیں۔ لیکن وہ اپریل کا مہینہ کیا، جس میں ہم دونوں پہلی مرتبہ ایک دوسرے سے آشنا ہوئے اور وہ لمحہ کیا، جس نے ہمیں زندگی کے مقدس ترین مرکز پر پہونچا دیا؟ کیا اس سے پہلے کہ ہمارا وجود، روز و شب کی گردشوں میں اسیر ہوتا۔ دستِ قدرت نے ہماری روحوں کو ایک مرکز پر کھڑا نہیں کیا تھا؟ سلمیٰ انسان کی زندگی ماں کے پیٹ سے شروع نہیں ہوتی، بلکہ اسی طرح، جیسے وہ قبر میں پہونچ کر ختم نہیں ہوتی، یہ وسیع فضا، جو چاند تاروں کی شعاعوں سے لبریز ہے، اُن روحوں سے خالی نہیں ہے، جو محبت اور دوستی کے رشتہ میں منسلک ہیں!"

سلمیٰ نے آہستگی کے ساتھ، میرے سر سے اپنا ہاتھ ہٹایا، لیکن بالوں کی جڑیں ایک ایسا کہربائی تموج چھوڑ گئی، جس سے رات کی لطیف ہوا اٹکھیلیاں کرتی اور اس کی نشو و حرکت کی قوت میں اضافہ کر دیتی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور اس پجاری کی طرح، جو قربان گاہ کو بوسہ دے کر سعادت و برکت حاصل کرتا ہے اپنے بھڑکتے ہوئے ہونٹوں پر رکھ کر، بوسہ دیا....... ایک طویل، گہرا اور خاموش بوسہ، جو اپنی حرارت سے انسان کے قلبی احساسات کو پگھلا دیتا ہے، اور اپنی شیرینی سے، روحِ فطرت کی پاکیزگی کو بالیدگی عطا کرتا ہے ایک گھنٹہ گزر گیا، جس کا ہر لمحہ، شوق و محبت کا ایک سال تھا۔ رات کی

خاموشی، چاندنی کرنوں اور درختوں اور پھولوں سے عطر بیز و بادہ ریز فضا نے، ہمیں اس مقام پر پہونچا دیا، جہاں انسان، محبت کی حقیقت کے سوا، سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اچانک ہم نے سنا کہ گھوڑے کی ٹاپوں اور گاڑی کے پہیوں کی آواز تیزی کے ساتھ ہم سے قریب ہو رہی ہے۔ اس آواز نے ہمیں پر لطف عالم خود فراموشی سے چونکا دیا، اور بیداری نے، ہمیں خوابوں کی دنیا سے، عالم حیرت و بدبختی میں پھینک دیا۔ اب ہمیں معلوم ہوا کہ فارس کرامہ، پادری کے گھر سے واپس آرہا ہے۔ ہم اٹھے اور اس کی آمد کے انتظار کے لیے، درختوں میں سے ہوتے ہوئے، دروازہ پر جا کر کھڑے ہو گئے۔

گاڑی باغ کے دروازہ کے پاس رکی۔ فارس کرامہ اترا، اور سر جھکائے... آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا، ہماری طرف آیا۔ ایک تھکے ماندے مزدور کی طرح، جس کے سر پر منوں بوجھ ہو، وہ سلمیٰ کی طرف بڑھا، اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیئے، وہ دیر تک اس کے چہرہ کو تکتا رہا، گویا اس بات سے ڈر رہا ہے کہ سلمیٰ کا چہرہ اس کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو جائے گا۔ اس کے جھریاں پڑے ہوئے رخساروں پر آنسو بہنے لگے، اس کے ہونٹ کانپے اور ایک غمگین تبسم کے ساتھ، گھٹی ہوئی آواز میں اس نے کہا:

"سلمیٰ! وہ وقت قریب آگیا ہے، جب تمہارا باپ تمہیں اپنے آغوش سے نکال کر ایک دوسرے مرد کے پہلو میں بٹھا دے گا...... ہاں! وہ وقت قریب آگیا ہے، جب قانون الٰہی تمہیں اس چار دیواری سے نکال کر دنیا کے وسیع میدان میں لے جائے گا۔ اس وقت یہ باغ تمہارے قدموں کی چاپ کو ترسے گا۔ اور

تمہارا باپ تم سے جدا ہو جائیگا۔ سلمیٰ! قدرت کا قلم چل چکا! اللہ تمہاری حفاظت کرے۔ اور وہ وقت تمہارے لئے مبارک ہو۔

سلمیٰ نے اپنے باپ کی گفتگو سنی، اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور آنکھیں جمی کی جمی رہ گئیں، گویا موت کا فرشتہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے بعد وہ شدت درد سے تڑپ اٹھی اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگی، جیسے کوئی پرندہ شکاری کے تیر سے زخمی ہو کر تکلیف و درد سے کانپتا، زمین پر آ پڑے ...... اور ایسی آواز میں، جو گہرے پیچ و تاب کی وجہ سے رک رک کر نکل رہی ہو، چلا کر اس نے کہا:

"آپ کیا فرما رہے ہیں؟ آپ کا مطلب کیا ہے؟ آپ مجھے کہاں بھیجنا چاہتے ہیں؟"

اس نے فارس کرامہ کو گھور کر دیکھا، گویا چاہتی تھی کہ اپنی نگاہوں سے اس پردہ کو چاک چاک کر دے، جو فارس کرامہ کے دل کی باتوں پر پڑا ہوا تھا۔ ایک منٹ کے بعد، جو قبروں کی فریاد سے ملتی جلتی خاموشی کے اثرات سے دبا ہوا تھا، اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا:۔

"اب میں سمجھ گئی ...... سب کچھ سمجھ گئی ...... پادری صاحب نے آپ کے شجر محبت کی تیلیوں سے اس شکستہ بال چڑیا کے لئے ایک پنجرہ بنایا ہے۔ کیوں ابا جان! یہی بات ہے نا؟"

فارس کرامہ نے گہرے اور ٹھنڈے سانسوں کے سوا کوئی جواب نہ دیا، وہ اُسے کوٹھی میں لے گیا، رحم و شفقت کی شعاعیں اس کے چہرہ سے پھوٹ رہی تھیں، میں درختوں کے درمیان کھڑا تھا اور حیرت، میرے جذبات کے ساتھ اٹھکھیلیاں کر رہی تھی جیسے آندھی کے جھکڑ، خزاں کے زرد پتوں کے ساتھ "اٹھکھیلیاں"

کرتے ہیں۔ بالآخر میں بھی ان کے پیچھے پیچھے کمرہ کی طرف ہو لیا۔ لیکن وہاں پہنچ کر اس خیال سے کہ باپ بیٹی میں کوئی خاص اور رازدارانہ گفتگو نہ ہونے والی ہو۔ میں نے فارس کرامہ سے رخصتی مصافحہ کیا اور سلمیٰ کو دیکھا، جیسے کوئی عالم طبیعیات آسمان کے چمکتے ہوئے ستارے کو دیکھے۔ میں کمرہ سے اس طرح نکلا کہ ان دونوں کو خبر تک نہ ہوئی۔ لیکن ابھی میں باغ ہی میں تھا کہ فارس کرامہ کی آواز میرے کانوں میں آئی، میں نے مڑ کر دیکھا۔ تو وہ اشارے سے مجھے بلا رہا تھا، میں واپس ہوا، اور جب اس کے قریب پہونچا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا:

"بیٹا، مجھے معاف کرنا، میں نے تمہاری ملاقات کے آخری حصہ کو آنسوؤں سے بدل دیا ...... لیکن تم تو ہمیشہ یہاں آتے رہو گے ...... کیا یہ غلط ہے؟ کیا جب یہ مکان ایک غمگین بڈھے کے سوا، ہر لطف سے خالی ہو جائے گا تو تم یہاں نہیں آؤ گے؟ بے شک نوجوانی، مرجھائے ہوئے بڑھاپے سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی، جس طرح، صبح کبھی شام سے نہیں ملتی ...... لیکن نہیں! تم میرے پاس ضرور آؤ گے، اور مجھے میری جوانی کے قصے سناؤ گے ...... اس جوانی کے قصے، جو میں نے تمہارے والد کے ساتھ گذاری ہے! مجھے یقین ہے کہ تم میرے سامنے زندگی کی داستان دہراؤ گے ...... اس زندگی کی داستان، جس نے کبھی مجھے اپنا نہیں سمجھا ...... کیوں؟ کیا یہ غلط ہے؟؟ کیا سلمیٰ کی رخصتی کے بعد، جب میں آبادی سے دور، اس مکان میں تنہا رہ جاؤں گا، تم مجھ سے ملاقات کے لیے نہیں آؤ گے؟؟

فارس کرامہ نے یہ الفاظ، دھیمی ہوئی آواز میں، رک رک کر ادا کیے۔ اور جب میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر، بغیر کچھ کہے، اسے ہلا دیا تو گرم آنسوؤں کے کچھ قطرے

اس کی پلکوں سے میرے ہاتھ پر گرے، میری روح کانپ اٹھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ایک غمگین و شیریں جذبہ، زبان پر آنے کے لئے، میرے سینہ میں مچل رہا ہے، جو بار بار ابھرتا ہے۔ اور بار بار گہرے پیچ و تاب کی طرح، دل کی گہرائیوں میں جا پڑتا ہے۔

جب میں نے اپنا سر اٹھایا اور فارس کرامہ نے دیکھا۔ کہ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہیں، تو وہ جھکا اور اپنے کانپتے ہونٹوں سے میری پیشانی کو بوسہ دیا اپنا منہ مکان کے دروازہ کی طرف پھیرتے ہوئے اس نے کہا۔

"شب بخیر...... بیٹا! شب بخیر!!"

بوڑھے آدمی کے رخساروں پر چھکنے والا آنسو، روح کے لئے نوجوانوں کے اشک خون سے زیادہ پرتاثیر ہوتا ہے۔

جوانی کے بے پناہ آنسو، درد بھرے دل سے امنڈتے ہیں۔ لیکن بڑھاپے کے آنسو، آخری عمر کی جھڑادن ہیں، جو آنکھوں کی پتلی سے ٹپکتے ہیں۔ یہ آنسو، ناتواں جسموں کی زندگی کا بچا کھچا سرمایہ ہوتے ہیں۔

جوانی کی پلکوں کے آنسو ایسے ہیں جیسے شبنم کے قطرے گلاب کی پتیوں پر لیکن بڑھاپے کے رخسار کے آنسو، خزاں کے ان زرد رنگ پتوں سے مشابہ ہیں جنہیں ہوا کے جھکڑ، زندگی کی بہاوٹ کے آنے سے ذرا پہلے، منتشر کرکے اڑا لیجاتے ہیں

فارس کرامہ کواڑوں کے پیچھے ہو گیا اور میں وہاں سے نکل آیا۔ سلمیٰ کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اس کا حسن، میری آنکھوں کے سامنے سائے کی طرح متحرک تھا۔ اور اس کے والد کے آنسو، جو میرے ہاتھ پر گرے تھے، رفتہ

رفتہ خشک ہو رہے تھے۔

میں اس کوٹھی سے اس طرح نکلا، جس طرح آدمؑ جنت سے نکلا تھا، لیکن میرے دل کی حوا، میرے پہلو میں نہ تھی، جو اس تمام دنیا کو اپنی رعنائی و زیبائی سے جنت بناتی،

میں وہاں سے یہ محسوس کرتے ہوئے نکلا، کہ یہی رات، جس میں میری نشاۃ ثانیہ ہوئی ہے، وہ رات بھی ہے، جس میں پہلی مرتبہ موت کا چہرہ چمکا،

آفتاب کی حرارت ہی کھیتوں اور باغوں کو زندگی عطا کرتی ہے اور آفتاب کی حرارت ہی انہیں موت کی نیند سلا دیتی ہے۔

(۷)

آتشیں جھیل

ایک انسان، جو کچھ رات کی تاریکیوں میں چھپ کر کرتا ہے، دوسرا انسان اسے دن کی روشنی میں علی الاعلان ظاہر کر دیتا ہے، وہ گفتگو جو ہم سکون و خاموشی کے عالم میں سرگوشی کے طور پر کرتے ہیں، ہماری لاعلمی میں، عام بات ہو جاتی ہے وہ کام، جو آج ہم اپنے گھر کی چار دیواری میں کرتے ہیں اور جسے دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں۔ کل ایک مجسمہ کی شکل میں چوراہوں پر نصب نظر آتا ہے۔

اسی طرح فارس کرامہ سے پادری کی ملاقات کے مقاصد، تاریک سایوں نے ظاہر کئے، اور اسی طرح اُن کی بات چیت، فضا کے منتشر ذرات نے سارے شہر میں عام کر دی، یہاں تک کہ میں نے بھی سن لی!

پادری نے فارس کرامہ کو اس چاندنی رات میں اس لئے نہیں بلایا تھا

کہ فقیروں اور محتاجوں کے حالات پر مبادلۂ خیال کرے: یا یتیموں اور بیواؤں کی اغاثت دخبر گیری کے لئے کوئی راستہ تجویز کرے، بلکہ اپنی خاص شان دار گاڑی بھیج کر اس لیے بلایا تھا کہ اس کی بیٹی سلمیٰ کے لئے، اپنے بھتیجے، منصور کا پیام دے۔

فارس کرامہ دولت مند تھا۔ اور سلمیٰ کے علاوہ کوئی اس کے مال وجائداد کا وارث نہ تھا۔ پادری نے سلمیٰ کو، اس کے حسن صورت یا اس کی عظمت نفس کی وجہ سے اپنی بھتیج بہو بنانا نہیں چاہا تھا۔ بلکہ اس لئے چاہا تھا، کہ وہ صاحب ثروت ہے۔ جو اپنی بے اندازہ دولت سے اس کے بھتیجے، منصور کے مستقبل کو سنوارے گی۔ اور اپنی بے شمار جائداد سے، اُسے شہر کے معزز اور مقتدر افراد میں ایک بلند مقام بنانے میں مدد دے گی۔

مشرق کے مذہبی پیشوا، ذاتی عظمت وسیادت پر بس نہیں کرتے، بلکہ وہ اس بات کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ اپنے عزیز واقرباء کو قوم کے اعلیٰ ترین افراد بنا دیں تاکہ وہ من مانے طریقوں پر اس کی دولت وقوت سے کھیلیں۔

مالدار کی عظمت، اس کی موت کے بعد اس کے بڑے بیٹے کو ملتی ہے لیکن مذہبی پیشوا کی عظمت اس کی زندگی ہی میں، سلسلہ بسلسلہ اس کے بھائی بھتیجوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ عیسائیوں کے پادری، مسلمانوں کے امام اور برہمنوں کے مہنت، یہ سب کے سب پانی کے سانپ ہیں، جو اپنے شکار کو... مختلف طریقوں سے دبوچتے اور طرح طرح سے اس کا خون چوستے ہیں۔

پادری نے، فارس کرامہ سے جب اس کی بیٹی سلمیٰ کو مانگا تو اس نے گہری خاموشی اور گرم آنسوؤں کے سوا، کوئی جواب نہ دیا۔ کون سا باپ ہے، جس پر اپنی

بیٹی کی جدائی شاق نہیں گزرتی، خام اس سے کہ وہ ہمسایہ کے گھر بیاہی جا رہی ہو۔ یا قصر شاہی میں؟ کون سا مرد ہے، جس کا دل غم و غصہ سے نہیں کانپ جاتا۔ جب قانون قدرت اس سے اس کی بیٹی کو جدا کرے۔ اور پھر بیٹی بھی وہ بیٹی جسے اس نے بچپن میں کھلایا ہو، نوجوانی میں لکھایا پڑھایا ہو۔ اور بالغ ہونے کے بعد ایک دم کے لئے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیا ہو۔

لڑکے کی شادی والدین کے لئے وجہ مسرت ہوتی ہے، اس لیے کہ گھر میں ایک نئے رکن کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور لڑکی کی شادی موجب غم، اس لئے کہ گھر کا ایک قدیم اور عزیز رکن کم ہو جاتا ہے۔

فارس کرامہ نے غیر اختیاری طور پر پادری سے مل کر لی اور طوعاً و کرہاً اس کی مرضی کے سامنے اپنا سر جھکا دیا، حالانکہ اس کا دل اسے برابر منع کر رہا تھا محض سنی سنائی باتوں پر نہیں، ذاتی تجربہ کی بنا پر وہ منصور کو بدمزاج، لالچی اور بداخلاق سمجھتا تھا۔ لیکن شام کا وہ کون سا عیسائی ہے، جو پادری کی مخالفت کرے اور پھر اہل ایمان میں شمار ہو؟ مشرق کا وہ کون سا مرد ہے، جو اپنے مذہبی پیشواؤں کے حلقہ سے نکل جائے۔ اور پھر لوگ اسے قابل عزت سمجھیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ آنکھیں تیر کا مقابلہ کریں اور نہ پھوٹیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہاتھ تلوار کا مقابلہ کریں اور نہ کٹیں۔

اچھا! فرض کرو کہ فارس کرامہ، پادری کی مخالفت کر سکتا تھا، اس کے امکان میں تھا کہ وہ پادری کے حرص و لالچ کا شکار ہونے سے بچ جائے، لیکن کیا، اس کے بعد اس کی بیٹی کی عزت لوگوں کی قیاس آرائیوں اور بدگمانیوں سے محفوظ

رہ جاتی اور کیا اس کا نام ہونٹوں اور زبانوں کی گندگی کے چھینٹوں سے پاک وصاف رہ جاتا؟

کیا انگور کے تمام بلند خوشے، گیدڑوں کے قانون میں کھٹے نہیں ہیں؟

اس طرح قدرت نے سلمیٰ کو مشرق کی کرموں پھوٹی عورتوں کے گروہ میں دھکیل دیا اور اس طرح اس کی پرعظمت روح کو جال میں پھنسا دیا، جبکہ وہ پہلے پہل، محبت کے سفید پروں پر، چاندنی کرنوں سے روشن اور پھولوں کی خوشبو سے معطر فضا میں، اڑی تھی۔

اکثر ملکوں میں باپ کی دولت، اولاد کی بدبختی کا سبب ہوتی ہے۔ بڑے بڑے خزانے، جنہیں باپ کی لگن اور ماں کا لالچ، جمع کرتا ہے، اولاد کے لیے.. تنگ وتاریک قید خانے ہو جاتے ہیں۔ وہ خدائے بزرگ جسے انسان روپیہ کی شکل میں پوجتا ہے، ایک خوفناک شیطان کی صورت اختیار کر کے، روحوں کو اذیت میں مبتلا کرتا اور دلوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔

سلمیٰ بھی اپنی جنس کی ان بہت سی لڑکیوں میں سے ایک تھی، جو اپنے باپ کی دولت اور اپنے شوہر کی ہوس کاریوں پر بھینٹ چڑھتی ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر فارس کرامہ مالدار نہ ہوتا تو سلمیٰ آج آزاد فضا میں زندگی کے عیش وراحت سے ہم کنار ہوتی۔

ایک ہفتہ گذر گیا، سلمیٰ کی محبت شام کو میرے پہلو میں بیٹھ کر، مجھے خوش نصیبی کے نغمے سناتی اور صبح ہوتے، ہستی کے اسرار اور زندگی کے مطالب سمجھانے کے لیے چونکا دیتی۔

بلند محبت، جو حسد کا نام تک نہیں جانتی، اس لیے کہ وہ بے نیاز ہے
جو جسم کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہونچاتی، اس لیے کہ اس کا تعلق براہِ راست
روح سے ہے!

قوی میلان، جو روح کو قناعت سے بھر دیتا ہے!
لطیف بھوک، جو دل کو فارغ بنا دیتی ہے!
شیریں جذبہ، جو شوق کو پیدا تو کر دیتا ہے، لیکن اسے بھڑکاتا نہیں!
انوکھی فریفتگی، جو زمین کو نعمتوں سے لبریز کر دیتی، اور زندگی کو خواب شیریں
بنا دیتی ہے۔

میں صبح ہی صبح کھیتوں میں نکل جاتا اور فطرت کی بیداری میں بقائے
دوام کے اشارے دیکھتا، دریا کے کنارے بیٹھ جاتا اور موجوں کے ابدی نغمے
سنتا، شہر کے بازاروں میں چکر لگاتا اور رہ گیروں کے چہروں اور کاروباری
لوگوں کی حرکتوں میں زندگی کے محاسن اور تہذیب و تمدن کی شادمانیوں
کا مشاہدہ کرتا!

وہ دن پرچھائیوں کی طرح گزر گئے، بادلوں کی طرح منتشر ہو گئے — اور
میرے لیے ان میں سے المناک یاد کے سوا کچھ نہیں رہا...... وہ آنکھیں،
جو کبھی بہار کے حسن اور سبزہ زاروں کی تازگی کا مشاہدہ کرتی تھیں، اب ان
کے لیے آندھیوں کی غضب ناکی ہے اور جاڑوں کی افسردگی!......
وہ کان، جو کبھی موجوں کے نغمے سنتے تھے، اب ان کے لیے مسکینوں کی کراہ
ہے اور دوزخ کی چیخ و پکار........ اور وہ روح، جو کبھی انسانی شادمانیوں

اور تمدنی عظمتوں کے سامنے مرعوب و متحیر کھڑی تھی، اب اس کے لئے دفینوں کی بدقسمتی ہے، یا محتاجوں کی بدبختی!

آہ! کس قدر خوشگوار تھا، محبت کا زمانہ! اور کس قدر شیریں تھے اس کے خواب!!

اور آہ! کس قدر تلخ ہیں، غم کی راتیں! اور کتنی زیادہ ہیں اُن کی... خوفناکیاں!!

ہفتہ گزرنے پر، جب کہ میرا دل، میرے جذبات کی شراب سے مست تھا۔ میں سلمیٰ کے گھر گیا...... وہ عبادت گاہ، جسے حسن نے تعمیر کیا اور محبت نے مقدس بنایا۔ تاکہ روحیں اس میں سجدۂ عبودیت ادا کریں۔ اور دل عجز و انکسار کے ساتھ جھکیں ...... جب میں وہاں پہونچا۔ اور اس خاموش چاردیواری میں داخل ہوا، تو میں نے ایک ایسی قوت کا وجود محسوس کیا، جو مجھے بہلاکر اپنی طرف کھینچ رہی تھی، جو مجھے اس دنیا سے نکال کر آہستہ آہستہ اس سحر آگیں عالم سے قریب کر رہی تھی، جو شور و شر سے خالی ہو۔ زاہد شب زندہ دار کی طرح، جسے قدرت خواب کی نزہت گاہوں میں پہونچادے۔ میں نے اپنے تئیں ان بارور درختوں اور شگفتہ پھولوں کے درمیان چلتے پایا، یہاں تک کہ میں کوٹھی کے دروازہ کے پاس پہونچ گیا۔ میں نے مڑکر دیکھا۔ سلمیٰ چنبیلی کے درخت کے سائے میں اسی بنچ پر بیٹھی تھی، جہاں ایک ہفتہ پہلے، اس رات کو، جسے فطرت نے ہمارے لئے انتخاب کیا تھا۔ اور جس میں میری خوش بختی اور بدبختی کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

ہم دونوں بیٹھے تھے!

میں خاموش اس کے پاس پہونچا۔ لیکن اس نے اپنی جگہ سے جنبش کی، نہ کوئی بات منہ سے نکالی، گویا میرے آنے سے پہلے اُسے میری آمد کی اطلاع ہو گئی تھی۔

جب میں اس کے پاس بیٹھا تو اس نے ایک منٹ تک میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورا اور ایک گہرا اور طویل ٹھنڈا سانس لیا۔ اس کے بعد وہ مڑی اور دور شفق کو دیکھنے لگی۔ جہاں رات کا ابتدائی حصہ، صبح کے آخری حصے سے کھیل رہا تھا۔

کچھ وقفہ کے بعد، جو اس پرفسوں خاموشی سے لبریز تھا۔ جس نے ہمیں غیر مرئی روحوں کے جشن میں پہونچا دیا تھا، سلمیٰ نے اپنا رُخ میری طرف کیا اور اپنے کانپتے ہوئے ٹھنڈے ہاتھ سے میرا ہاتھ پکڑا۔ جس طرح کوئی بھوکا شدت تکلیف سے گفتگو کرنے پر قادر نہ ہو، اس نے کہا:

میرے چہرہ کی طرف دیکھو میرے حبیب! میرے چہرہ کی طرف دیکھو اور اچھی طرح غور کرو، تم جو کچھ گفتگو کے ذریعہ مجھ سے معلوم کرنا چاہتے ہو، وہ سب تمہیں معلوم ہو جائے گا .... میرے حبیب میرے چہرہ کو دیکھو، ...... غور سے دیکھو۔ میرے دوست!"

میں نے اس کے چہرہ کی طرف نگاہ کی .... طویل نگاہ: .....

میں نے دیکھا کہ وہ آنکھیں، جو کچھ دن پہلے لبوں کی طرح متبسم اور کوئل کے پروں کی طرح متحرک تھیں، دھنس گئی ہیں، ان میں وہ پہلا سا نور باقی نہیں

رہا۔ درد و الم کی پرچھائیوں نے انہیں سیاہ کر دیا ہے ..... میں نے دیکھا کہ وہ چہرہ جو کل تک سفید چنبیلی کے اس پھول سے مشابہ تھا جسے آفتاب کے بوسوں نے شگفتہ کر دیا ہو، زرد پڑ گیا ہے، مرجھا گیا ہے اور یاس و نومیدی کی نقاب اس پر پڑی ہے ...... میں نے دیکھا کہ وہ ہونٹ، جو گلاب کی طرح سرخ تھے، جن سے شیرینی ہر وقت ٹپکتی تھی اور جو کھلتے وقت ایسے معلوم ہوتے، جیسے دو گلاب ہوا میں جھوم رہے ہوں، خزاں نے انہیں ایک سوکھی ہوئی شاخ پر چھوڑ دیا ہے ..... میں نے دیکھا کہ وہ گردن، جو پہلے ہاتھی دانت کے ستون کی طرح سیدھی تھی، آگے کی طرف جھک گئی ہے۔ گویا اس میں اتنی قوت نہیں ہے کہ دماغی گوشوں میں گردش کرنے والے خیالات کا بار اٹھا سکے۔

سلمیٰ کے خدوخال میں، میں نے یہ دردناک انقلابات دیکھے، اس کے تمام ذہنی و جسمانی تغیرات پر غور کیا۔ لیکن پھر بھی وہ میری نگاہ میں ایک لطیف بادل تھی، جو چاند کو چھپا کر، اس کے منظر میں حسن و جلال کا اضافہ کر دیتا ہے۔

وہ خدوخال، جو ذاتِ معنوی کے اسرار کی پردہ کشائی کرتے ہیں، چہرہ میں حسن و ملاحت پیدا کر دیتے ہیں، چاہے وہ اسرار درد انگیز اور المناک ہی کیوں نہ ہوں لیکن وہ چہرے، جو اپنی خاموشی سے روح کے بھیدوں کو بیان نہیں کرتے، حسین نہیں کہے جا سکتے، چاہے ان کے نقش و نگار کتنے ہی دل پذیر کیوں نہ ہوں!

وہ پیالے جو شراب کے رنگ سے رنگین نہ ہوں، ہمارے ہونٹوں کو اپنی طرف مائل نہیں کر سکتے! سلمیٰ اس دن شام کو آسمانی شراب سے لبریز پیمانہ کی مثال تھی، جس میں روح کی شیرینی کے ساتھ زندگی کی تلخیاں بھی شامل تھیں

وہ اپنی لاعلمی میں، مشرقی عورت کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر تھی، جو اپنے عزیز باپ کا مکان اس وقت تک نہیں چھوڑتی، جب تک کسی بدمزاج شوہر کی بندگی کا جُوا اپنی گردن پر نہ رکھ لے اور اپنی مہربان ماں کے پہلو سے اس وقت تک جدا نہیں ہوتی جب تک کہ بے رحم ساس کی غلامی میں زندگی بسر نہ کرے!

میں سلمیٰ کے چہرہ کو تک رہا تھا۔ میرے کان اس کے رُک رُک کر نکلتے ہوئے سانسوں میں اس کی رُوح کی فریاد سُن رہے تھے اور میرا دماغ اس کے متعلق کچھ سوچ رہا تھا۔ فضاء پر کامل سکوت طاری تھا۔ یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا کہ زمانہ چلتے چلتے رک گیا ہے، اور ہستی فنا ہو کر روپوش ہو گئی ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں کے سوا، جو میری رُوح کی گہرائیوں کو تک رہی تھیں، مجھے کچھ نظر نہ آتا تھا اور اس کے لرزتے ہوئے ٹھنڈے ہاتھ کے سوا، جو میرے ہاتھ میں تھا، مجھے کچھ محسوس نہ ہوتا تھا۔ میں اسی عالم خود فراموشی میں تھا کہ میں نے سلمیٰ کو آہستہ آہستہ کہتے سُنا!

"آؤ! اب باتیں کریں۔ آؤ! اس سے پہلے کہ مستقبل اپنی ہولناکیوں، اور دہشت نمائیوں کے ساتھ ہم پر حملہ آور ہو، ہم اس کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کریں اس وقت ابا جان تو اس شخص کے گھر گئے ہیں، جو زندگی بھر میرا رفیق رہے گا۔ وہ مرد، جسے اللہ نے میری ہستی کا سبب بنایا، اس مرد سے ملنے گیا ہے، جسے قانون ارضی نے میرے مستقبل کا مالک کہلائے گا...... اس شہر کے وسط میں اس وقت ایک معمر آدمی، جس نے مجھے پالا پوسا ہے، اس نوجوان سے باتیں کر رہا ہے، جو میری آئندہ زندگی میں، میرے ساتھ رہے گا۔ آج رات کو ابا جان اور میرا منگیتر، میرے نکاح کی تاریخ ٹھہرائیں گے، جو ایک نہ ایک دن آکر رہے گی، چاہے وہ کتنی ہی طویل

کیوں نہ ہو ......آہ! کس قدر عجیب ہے یہ ساعت!! اور کس قدر شدید ہے اس کی تاثیر!!!.....گذشتہ ہفتہ کی آج ہی جیسی رات کو اسی چنبیلی کے سائے میں محبت پہلی مرتبہ میری روح سے گلے ملی، جب کہ دستِ قضا، پادری کے گھر میں میری مستقبل کی تصویر کا ابتدائی خاکہ بنا رہا تھا۔ اور اس وقت جب کہ ابا جان اور میرا ہونے والا شوہر، میرے سر پر ازدواجی تاج رکھنے کی تجویزیں کر رہے ہیں، میں تمہیں اپنے پاس بیٹھا دیکھ رہی ہوں اور محسوس کر رہی ہوں کہ تمہاری روح.. مضطربانہ طور پر، میرے گرد چکر لگا رہی ہے، جس طرح پیاسا پرندہ پانی کے اُس چشمہ کی سطح پر منڈلاتا ہے، جسے چاروں طرف سے خوفناک اور بھوکے درندوں نے گھیر رکھا ہو......آہ! کس قدر شاندار ہے یہ رات اور کتنے گہرے ہیں اس کے اسرار!!" مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ناامیدی نے تاریک اور خوفناک سائے کی شکل اختیار کر لی ہے، جو ہماری محبت کا گلا گھونٹ رہا ہے تاکہ آغاز ہی میں اس کا کام تمام کر دے۔ میں نے جواب دیا:-

"یہ پرندہ، چشمہ پر یونہی منڈلاتا رہے گا، یہاں تک کہ پیاس اسے گھلا گھلا کر مار ڈالے، یا خوفناک درندہ اُسے دبوچ لے اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے نگل جائے"

چاندی کے تاروں کی طرح لرزتی ہوئی آواز میں اُس نے کہا:-

"نہیں! نہیں!! میرے دوست، اس پرندہ کو زندہ رہنا چاہیئے۔ اس بلبل کو چہچہاتے رہنا چاہیئے، یہاں تک کہ صبح ہو جائے، یہاں تک کہ بہار ختم ہو جائے، یہاں تک کہ دنیا ختم ہو جائے۔ یہاں تک کہ زمانہ ختم ہو جائے۔ تم اسے خاموش نہ کرو، کیونکہ اس کی آواز مجھے زندگی بخشتی ہے۔ تم اس کے پر نہ باندھو، اس

لیے کہ ان کی پھڑپھڑاہٹ میرے دل سے غم کی کہر کو چھانٹتی ہے۔"

میں نے ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے آہستہ سے کہا:۔

"سلمیٰ! پیاس اس کا کام تمام کردے گی اور خوف اس کو مار ڈالے گا!!"

اس نے جواب دیا، اس طرح کہ الفاظ اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے جلدی جلدی نکل رہے تھے:۔

"روح کی پیاس، مادی سیرابی سے زیادہ شیریں اور روح کا خوف، جسمانی اطمینان سے زیادہ محبوب ہوتا ہے، لیکن میرے حبیب سنو...... غور سے سنو اس وقت میں ایک نئی زندگی کے دروازہ پر کھڑی ہوں، جس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں اس اندھی عورت کی طرح ہوں۔ جو ٹھوکر کھانے کے خوف سے دیوار کو پکڑ پکڑ کر چلے۔ میں ایک لونڈی ہوں، جس کے باپ کی دولت نے اُسے بردہ فروشوں کے بازار میں پہونچا دیا اور وہ ایک مرد کے ہاتھ فروخت کردی گئی، میں اس مرد سے محبت نہیں کرتی، اس لئے کہ میں اُسے نہیں جانتی، اور یہ تو... تمہیں معلوم ہی ہے۔ کہ محبت اور جہالت کا ایک جگہ جمع ہونا، ناممکن ہے، لیکن میں اس سے محبت کرنا سیکھوں گی، میں اس کی اطاعت و خدمت کرکے اُسے خوش قسمت بناؤں گی، میں اسے وہ سب کچھ دوں گی، جو کمزور عورت طاقتور مرد کو دے سکتی ہے۔ لیکن تم...... تم ہمیشہ بہار در آغوش رہو گے!! زندگی تمہارے سامنے ایک کھلا راستہ ہے، جس پر طرح طرح کے پھول پڑے ہیں، تم اپنے دل کا چراغ لے کر دنیا کے میدان میں نکلو گے، تم آزادی سے سوچو گے، آزادی سے گفتگو کرو گے۔ اور اپنی ہر خواہش آزادی سے تکمیل کو

پہنچاؤ گے! تم زندگی کے چہرہ پر اپنا نام لکھو گے۔ اس لیئے کہ تم مرد ہو۔ تم سرداروں
کی سی زندگی بسر کرو گے۔ اس لیئے کہ تمہارے والد کی مفلسی نے تمہیں کسی کا غلام
نہیں بنایا اور اُن کے مال و دولت نے تمہیں بردہ فروشوں کے بازار میں نہیں
پہونچایا جہاں لڑکیوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ تم اس لڑکی کا قرب حاصل
کرو گے۔ جسے تمہارا دل پسند کرے گا۔ تم اسے اپنے گھر کی ملکہ بنانے سے پہلے
اپنے دل کی ملکہ بناؤ گے اور اسے اپنے شب و روز میں شریک کرنے سے پہلے اپنے
افکار میں شریک کرو گے!!

وہ سانس لینے کے لیئے کچھ دیر ٹھہر گئی! پھر ایسے لہجہ میں، جس میں اس کے
دل کا پیچ و تاب شامل تھا، اس نے کہا:۔

"لیکن کیا زندگی کے راستے اب ہمیں ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے
تمہیں مردانہ عظمتوں کی طرف لے جائیں گے اور مجھے عورت کے فرائض کی طرف؟
کیا یہ حسین خواب، بیداری سے بدل جائے گا۔ اور یہ شیریں حقیقت افسانہ ہو جائے گی
کیا شور و شغب اس طرح بلبل کے نغموں کو جذب کرے گا۔ ہوا اس طرح گلاب
کی پتیوں کو منتشر کر دے گی اور قدم اس طرح جام شراب کو روند ڈالیں گے؟
کیا اس رات نے یونہی ہمیں چاند کے سامنے کھڑا کیا تھا۔ اور یوں ہی ہماری روحوں
کو اس چنبیلی کے سائے میں ملایا تھا؟ کیا اس رات نے تیزی کے ساتھ ہمیں
عالم انجم میں اس لیئے پہونچایا تھا کہ ہمارے بازو تھک جائیں اور ہم دوزخ کے
سب سے آخری حصے میں جا پڑیں؟ کیا ہم حریم شوق میں اس وقت داخل
ہوئے تھے، جب محبت سو رہی تھی، جو اب وہ غصے کی حالت میں بیدار ہو کر

ہمیں سزا دینا چاہتی ہے؟ کیا ہمارے سانسوں نے بادشب کی لطیف موجوں
میں اس لیے ہیجان برپا کیا تھا کہ وہ آندھی کے جھکڑ بن کر، ہمیں گرد و غبار
کی طرح وادی کی گہرائیوں میں پھینک دے؟ ہم نے تو کوئی نافرمانی بھی
نہیں کی، شجر ممنوعہ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا، پھر ہمیں جنت سے کیوں نکالا جا
رہا ہے؟ ہم نے تو کوئی سازش بھی نہیں کی، سرکشی کے قریب تک نہیں پھٹکے
پھر ہمیں جہنم میں کیوں جھونکا جا رہا ہے؟ نہیں، نہیں! کبھی نہیں!! وہ لمحے، جن
میں ہم ایک دوسرے سے آشنا ہوئے، صدیوں سے زیادہ عظیم الشان ہیں اور
وہ کرن، جس نے ہماری روحوں کو ہیجان آمادہ کیا، تاریکی سے زیادہ قوی ہے
اس لیے اگر طوفان باد نے، غضب ناک سمندر کی سطح پر ہمیں ایک دوسرے
سے علیحدہ بھی کر دیا تو موجیں ہمیں پرسکون ساحل پر ایک جگہ جمع کر دیں گی۔
اگر زندگی نے ہمیں مار بھی دیا، تو موت ہمیں جلا دے گی۔

عورت کا دل زمانہ کے ساتھ بدلتا ہے، نہ موسموں کے ساتھ، وہ مدت
تک برسر پیکار رہتا ہے لیکن مرتا نہیں؛ وہ اس جنگل سے مشابہ ہے، جسے
انسان اپنے جدال و قتال کے لیے منتخب کر کے اس کے درختوں کو کاٹ ڈالتا
اس کی جھاڑیوں کو جلا دیتا، اس کی چٹانوں کو خون سے رنگین کر دیتا اور اس
کی زمین کو ہڈیوں اور مردہ کھوپریوں سے پاٹ دیتا ہے، لیکن وہ جنگل پھر
بھی اطمینان و خاموشی کے ساتھ باقی رہتا ہے۔ اور ابدالآباد تک اس
میں بہار، بہار رہتی ہے اور خزاں، خزاں!.... لیکن اب کہ قلم چل
چکا ہے، ہم کیا کریں؟ مجھے بتاؤ ہم کیا کریں، کس طرح ایک دوسرے سے

الگ ہوں اور پھر کب ملیں؟ کیا ہم محبّت کو پردیسی مسافر سمجھیں، جو شام ہوتے آتا اور صبح ہوتے چلا جاتا ہے؟ کیا ہم اس روحانی جذبہ کو، خواب سمجھیں، جو نیند میں نظر آتا اور بیداری میں غائب ہو جاتا ہے؟ کیا ہم اس ہفتہ کو نشہ کی گھڑی سمجھیں جو ہوش و بیداری کے آتے ہی ختم ہو جاتی ہے؟...... میرے حبیب! اپنا سر اونچا کرو؛ تاکہ میں تمہاری آنکھیں دیکھوں، اپنے لبوں کو جنبش دو! تاکہ میں تمہاری آواز سنوں!! بولو! بات کرو!! مجھے بتاؤ! کہ جب طوفان ہمارے اس خوشگوار دور کی کشتی کو غرق کر دے گا، تم مجھے یاد کروگے؟ کیا تم رات کی خاموشی میں میرے بازوؤں کی صدائے پرواز سنوگے کیا تم میرے سانسوں کو اپنے چہرہ اور گردن پر موجزن، محسوس کروگے؟ کیا تم میرے درد سے بلند اور پیچ و تاب سے پست ہوتے ہوئے ٹھنڈے سانسوں کو سنوگے؟ اور کیا تم میرے سائے کو، جو ظلمت شب کا ہم قدم ہوگا، صبح کے بادلوں کے ساتھ منتشر ہوتے دیکھوگے؟ میرے محبوب! مجھے بتاؤ..... مجھے بتاؤ کہ میری آنکھوں کے نور، میرے کانوں کا نغمہ اور میری روح کے پر پرواز ہونے کے بعد تم کیا ہوگے؟...... تم کیا ہوگے؟!

میرے دل کے ٹکڑے خون ہو ہو کر میری آنکھوں میں آرہے تھے میں نے جواب دیا:۔

سلمیٰ! میں وہی ہوں گا، جو تم میرے لیے چاہوگی!!

اس نے کہا۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے چاہو! میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے ابدالآباد تک

چاہو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے اس طرح چاہو جس طرح شاعر اپنے غمگین افکار کو چاہتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے یاد کرو، جس طرح مسافر ٹھہرے ہوئے پانی کے اس حوض کو یاد کرتا ہے، جس میں پانی پینے سے پہلے وہ اپنے چہرہ کا عکس دیکھتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے یاد کرو، جس طرح ماں اپنے غیر مولود بچہ کو یاد کرتی ہے، جو دنیا کی روشنی دیکھنے سے پہلے ہی اس کے پیٹ میں مرگیا ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے یاد رکھو، جس طرح مہربان بادشاہ اس قیدی کو یاد رکھتا ہے، جو اس کی معافی سے پہلے ہی قیدخانہ میں سڑ جائے! میں چاہتی ہوں کہ تم میرے لیے ایک بھائی، ایک دوست اور ایک رفیق رہو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم ابا جان کی تنہائی کے زمانہ میں ان کے پاس جاتے اور ان کا دل بہلاتے رہا کرو، کیونکہ میں بہت جلد ان سے جدا ہونے والی ہوں!"

میں نے جواب دیا:

"سلمیٰ! میں یہ سب کچھ کروں گا، میں اپنی روح کو تمہاری روح کا غلاف اپنے دل کو تمہارے حسن کا گھر، اور اپنے سینہ کو تمہارے غموں کی قبر بنادوں گا سلمیٰ! میں تم سے محبت کروں گا، جس طرح کھیت بہار سے محبت کرتے ہیں اور تمہاری وجہ سے زندہ رہوں گا، جس طرح پھول آفتاب کی حرارت سے زندہ رہتے ہیں۔ میں تمہارے نام کے گیت گاؤں گا، جس طرح آبادی کی عبادت گاہوں کے گھنٹوں کی گونج سے وادی مترنم ہوتی ہے! میں تمہاری روح کی باتیں سنوں گا، جس طرح ساحل موجوں کی حکایت سنتا ہے۔ سلمیٰ میں تمہیں یاد کروں گا، جس طرح وحشت زدہ پردیسی اپنے پیارے وطن کو یاد

کرتا ہے! جس طرح بھوکا فقیر، مرغوب کھانوں سے چنے ہوئے دسترخوان کو یاد کرتا ہے، جس طرح معزول بادشاہ اپنے عظمت و وقار کے دنوں کو یاد کرتا ہے اور جس طرح غم زدہ قیدی، اپنی آزادی اور اطمینان کی گھڑیوں کو یاد کرتا ہے میں تمہیں یاد رکھوں گا، جس طرح کسان، اناج کے ڈھیروں اور اُن کی آمدنی کو اور نیک دل چرواہا شاداب سبزہ زاروں اور میٹھے چشموں کو یاد رکھتا ہے!!"

میں بات کر رہا تھا اور سلمیٰ رات کی گہرائیوں پر نگاہ جمائے، گھڑی گھڑی ٹھنڈے سانس لے رہی تھی، اس کے دل کی حرکت کبھی تیز ہو جاتی تھی کبھی سست، گویا سمندر کی موجیں ہیں، جو کبھی چڑھتی ہیں، کبھی اترتی ہیں، اس نے کہا:- "کل حقیقت، افسانہ ہو جائے گی اور خواب، بیداری! تو کیا عاشق کے لئے کافی ہے کہ سائے سے گلے مل لے اور کیا پیاسے کے لئے ممکن ہے۔ کہ خواب کے چشموں سے سیراب ہو جائے؟"

میں نے جواب دیا:-

"تقدیر کل تمہیں اُس گھر میں لے جائے گی، جو راحت و اطمینان کا مسکن ہے۔ اور مجھے دنیا کے میدان میں، جو محنت و کشمکش کی آماج گاہ ہے۔ تمہیں اس مرد کے گھر لے جائے گی، جو تمہارے حُسن سے سعادت اور تمہاری روح سے پاکیزگی حاصل کرے گا۔ اور مجھے زمانہ کی کمین گاہوں میں، جو اپنی غم آفرینیوں سے مجھے تکلیف پہونچائیں گی۔ اور اپنی ڈراؤنی تصویروں سے مجھے خوف زدہ کریں گی۔ تمہیں زندگی کی طرف لے جائے گی اور مجھے کشمکش کی طرف! تمہیں اُنس و محبت کی طرف لے جائے گی۔ اور مجھے وحشت و تنہائی کی طرف! لیکن

میں موت کے سائے کی وادی میں محبت کی ایک مورتی بنا کر اس کی پوجا کرونگا
اُسے اپنا رفیق شب بناؤں گا۔ اُسے اپنے گیت سناؤں گا، اُسے شراب پلاؤنگا
اور اسے اپنا لباس پہناؤں گا۔ صبح ہوتے محبت مجھے نیند سے چونکا دے گی اور
دور کسی جنگل میں لے جائے گی۔ جب دوپہر ہوگی۔ تو وہ مجھے درختوں کے سائے
میں بٹھائے گی۔ اور میں سورج کی تمازت سے محفوظ پرندوں کے ساتھ وہاں
آرام کروں گا۔ شام کو وہ مجھے قبلہ رو کھڑا کرے گی۔ اور فطرت کا الوداعی نغمہ سنائیگی
جو دن کے خاتمہ پر گایا جاتا ہے! اور فضا میں تیرتی ہوئی خاموشی کی پرچھائیاں
دکھلائے گی۔ رات کو میں محبت کے گلے میں ہاتھ ڈال کر سو جاؤں گا۔ خواب
میں مجھے وہ بلند اور مقدس عالم نظر آئیں گے، جہاں عاشقوں اور شاعروں
کی روحیں رہتی ہیں؛ موسمِ بہار میں، میں اور محبت پہلو بہ پہلو سیر کریں گے۔
ہم دونوں ٹیکوں اور گھاٹیوں کے درمیان گیت گائیں گے۔ بنفشہ اور بابونہ کے
پھولوں سے پُر بہار زندگی کے نقش قدم پر چلیں گے۔ اور شبنم کی بچی کھچی شراب
نرگس اور چنبیلی کے پیالوں میں پیئں گے، گرمیوں کے موسم میں، میں اور محبت
تھک کر سو جائیں گے۔ ہمارا تکیہ، کوڑے کرکٹ کا ڈھیر، ہمارا بستر، گھاس پھونس
اور ہمارا لحاف، آسمان ہوگا اور ہم چاند تاروں کے ساتھ جاگیں گے۔ خزاں کے
موسم میں، میں اور محبت انگوروں کے تختوں میں جائیں گے۔ اور ان مقامات
کے قریب بیٹھ کر، جہاں شراب کشید کی جاتی ہے، اُن درختوں کو دیکھیں گے
جنہوں نے اپنا زرد لباس اتار دیا ہے اور سمندر کی طرف جاتے ہوئے پرندوں
کے غولوں پر غور کریں گے۔ جاڑوں کے موسم میں، میں اور محبت انگیٹھیوں کے

پاس بیٹھ کر ماضی کی کہانیاں سنائیں گے اور گذشتہ قوموں اور قبیلوں کی داستانیں دہرائیں گے۔ جوانی میں محبت میرے لئے تہذیب آموز اور ادھیڑ عمر میں میرا بازو اور بڑھاپے میں میری مونس ہوگی۔

سلمیٰ محبت تمام عمر میرے ساتھ رہے گی، یہاں تک کہ مجھے موت آجائے یہاں تک کہ دست قدرت مجھے اور تمہیں ایک جگہ جمع کر دے!"

الفاظ میری روح کی گہرائیوں سے اتنی تیزی کے ساتھ نکل رہے تھے گویا وہ آگ کے شعلے ہیں جو کھڑک کر ہوا میں لہراتے ہیں۔ اور پھر بجھ کر حقیقت میں فنا ہو جاتے ہیں۔ سلمیٰ میری گفتگو سن رہی تھی۔ اور آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے، گویا اس کی پلکیں، لب ہیں، جو میری باتوں کا جواب آنسوؤں سے دے رہے ہیں! وہ لوگ جنہیں محبت نے بازو عطا نہیں کئے۔ بادلوں کی دنیا میں نہیں اڑ سکتے، جہاں سے وہ اس پُر فسوں عالم کو دیکھ سکیں، جس میں میری اور سلمیٰ کی روح، اس انوکھی ساعت میں منڈلا رہی تھی، جس کی فرحتیں، غم آفریں تھیں۔ اور جس کے درد و الم فرحت بخش۔ وہ لوگ جنہیں محبت نے اپنا پیرو نہیں بنایا، اور جنہوں نے محبت کو گفتگو کرتے نہیں سنا۔ یہ کہانی ان کے لئے نہیں لکھی گئی۔ یہ لوگ، اگر ان حقیر صفحات کے معنی سمجھ بھی لیں تو بھی ان کے لئے یہ ناممکن ہے، کہ ان سطروں میں ان خیالات اور تصورات کا عکس دیکھ سکیں، جنہیں نہ روشنائی لباس پہنا سکتی ہے۔ نہ کاغذ ان کے لئے آغوش بن سکتا ہے۔ لیکن وہ کون سا انسان ہے، جس نے محبت کی شراب، اس کے کسی پیالہ میں نہ پی ہو؟ وہ کونسی روح ہے جو اس روشن عبادت گاہ میں۔

جس کی زمین، دل کے ٹکڑوں سے بنی ہے اور چھپت رازوں، خوابوں اور جذبات سے ..... خوف زدہ نہ کھڑی ہوئی ہو؟ وہ کون سا پھول ہے، جس کی پتیوں پر صبح نے... شبنم کے قطرے نہ ٹپکائے ہوں؟ اور وہ کونسی ندی ہے، جو اپنا رستہ چھوڑ کر بھی سمندر سے نہ مِل گئی ہو؟

سلمیٰ نے اپنا سر، تاروں سے سجے ہوئے آسمان کی طرف اُٹھایا اور اپنے ہاتھ آگے کی طرف پھیلائے۔ اُس کی آنکھیں باہر نکل آئیں، ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور زرد چہرہ پر یاس و الم اور شکوہ و شکایت کی وہ تمام کیفیات نمایاں ہوگئیں، جو ایک مظلوم عورت کے دل میں ہوتی ہیں، اُس نے بلند آواز سے کہا :-

"یارب! عورت نے آخر کیا کیا ہے، جو وہ تیرے غضب کی مستحق ہوگئی؟ اس سے ایسا کون سا گناہ سرزد ہوا ہے، جو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تیری ناراضگی کا شکار ہوگئی؟ اس نے ایسے کون سے جرم کا ارتکاب کیا ہے، جس کی تلافی نہیں ہوسکتی اور جس کی وجہ سے وہ نامعلوم مدت تک کے لئے عذاب میں مبتلا کردی گئی؟

یارب! تو توی ہے اور وہ کمزور، پھر تو کیوں اُسے درد و کرب سے ہلاک کرتا ہے؟ تو بزرگ ہے اور وہ تیرے تخت کے اردگرد رینگ رہی ہے، پھر تو کیوں اُسے اپنے قدموں میں روندتا ہے؟ تو شدید آندھی ہے اور وہ تیرے سامنے غبار، پھر تو کیوں اُسے برف پر پھینکتا ہے؟ تو زبردست ہے اور وہ غریب، پھر تو اس سے کیوں لڑتا ہے؟ تو بصیر و علیم ہے اور وہ اندھی اور گمراہ، پھر تو کیوں اُسے موت کے گھاٹ اُتارتا ہے؟ تو نے اُسے محبت سے پیدا کیا، پھر تو کیوں اُسے محبت سے مارتا ہے؟ تو اُسے اپنی دائیں جانب سے سہارا دیتا ہے اور بائیں جانب

سے دوزخ میں پھینک دیتا ہے اور وہ مورکھ ہے۔ نہیں جانتی کہ تو اُسے کس طرح اٹھاتا ہے اور کس طرح گرا دیتا ہے؟ تو اس کے سینہ میں زندگی کے لطیف جھونکے پھونکتا ہے۔ اور اس کے دل میں موت کے بیج بوتا ہے۔ تو اُسے نیک بختی کے راستہ پر پیادہ پا لے جاتا ہے۔ اور اس کے بعد بدبختی کو گھوڑے پر سوار کر کے، اُس کے شکار کے لئے بھیج دیتا ہے۔ تو اس کے گلے میں فرحت و نشاط کے نغمے بکھیرتا ہے اور پھر اس کے ہونٹوں پر حزن و ملال کا قفل چڑھا کر اُس کی زبان کو درد و غم سے جکڑ دیتا ہے۔ تو اپنی مخفی انگلیوں سے اس کے درد کو لطف و لذت سے رشتہ بداماں کرتا ہے۔ اور اپنی ظاہری انگلیوں سے اس کی لذتوں کے اردگرد درد کا گھیرا ڈال دیتا ہے۔ اس کی سیج میں راحت و سلامتی کو چھپا دیتا ہے۔ اور اس سیج کے ایک طرف خوف و درماندگی کو بٹھا دیتا ہے۔ اپنے ارادہ سے اس کے میلانات کو بیدار کرتا ہے۔ اور اُن میلانات سے اس کے عیبوں اور ذلتوں کو پیدا کر دیتا ہے۔ اپنی مرضی سے اُسے کائنات کے محاسن کا مشاہدہ کراتا ہے۔ اور اپنی مرضی سے اس کی محبت کو حسن کے ذریعہ ہلاکت آفریں بھوک میں تبدیل کر دیتا ہے اپنے قانون کے ماتحت اس کی رُوح کو ایک حسین جسم سے بیاہ دیتا ہے اور اپنے حکم سے ایک اور کمزور و ذلیل جسم کو اس کا شوہر بنا دیتا ہے۔ تو اُسے موت کے پیالے میں زندگی پلاتا ہے اور زندگی کے پیالے میں موت! تو اُسے اُس کے آنسوؤں سے پاک کرتا ہے اور پھر اُسی کے آنسوؤں سے اُسے گھلا گھلا کر مار بھی ڈالتا ہے، تو جس مرد کی روٹی سے اُسے شکم سیر کرتا ہے، اُس مرد کی آغوش اس کے دل کے ٹکڑوں سے بھر دیتا ہے۔ یا رب! تو ہی ہے!! ہاں! تو ہی ہے، جس

نے محبت کی روشنی سے میری آنکھیں کھولیں اور محبت کی روشنی سے مجھے اندھا کر دیا تو نے اپنے ہونٹوں سے مجھے بوسہ دیا۔ اور اپنے قوی ہاتھوں سے تھپڑ مار دیا۔ تو نے میرے دل میں سفید گلاب بویا اور اس کے ارد گرد کانٹے اور گوکھرو پیدا کر دیئے تو نے میرے حال کو ایک نوجوان روح سے جسے میں چاہتی ہوں، مربوط و مستحکم کر دیا۔ اور میرے مستقبل کو، ایک مرد کے جسم سے، جسے میں نہیں جانتی، جکڑ دیا۔

یارب! اس مرگ آسا مقابلہ کے لیے مجھے استقامت عطا فرما اور زندگی کے آخری سانس تک امانت دار اور پاکباز رہنے میں میری مدد کر ۔۔۔۔ یارب اپنی مشیت کو میری دعا سے ہم آہنگ فرما!! یارب! اپنے نام کو ابدالآباد تک بابرکت رکھ"!! سلمیٰ خاموش ہو گئی، لیکن اس کے خد و خال برابر گفتگو کرتے رہے۔ بالآخر اس کا سر جھک گیا۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے اور جسم سمٹ گیا، گویا زندگی کی قوتوں نے جواب دے دیا ہے۔ دیکھنے والے کو وہ ایسی معلوم ہونے لگی گویا ایک شاخ ہے۔ جسے آندھی نے درخت سے علیحدہ کر کے کسی گڑھے میں خشک ہونے اور زمانہ کے قدموں کے نیچے روندے جانے کے لیے پھینک دیا ہے۔

اس نے اپنا برف جیسا ٹھنڈا ہاتھ میرے پھڑکتے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا اور میں نے اس کی انگلیوں کو اپنے لبوں اور پلکوں سے بوسہ دیا۔ لیکن جب میں نے زبانی طور پر اُسے تسلی دینی چاہی تو اپنے تئیں اس سے زیادہ شفقت اور تسلی کا سزاوار پایا۔ میں خاموش و حیران بیٹھا سوچتا رہا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ زمانہ میرا مذاق اڑا رہا ہے، میرے کانوں میں میرے دل کی فریاد گونج رہی تھی اور میں ڈر رہا تھا کہ کہیں میرا نفس ہی اپنی تباہی کا سبب ہو۔

ہم دونوں میں سے کسی نے بات نہ کی، اس لیے کہ جب سوزش دل بڑھ جاتی ہے، تو آدمی گونگا ہو جاتا ہے! ہم بالکل ساکت و جامد تھے، گویا سنگ مرمر کے دو ستون ہیں، جنہیں زلزلوں نے زمین میں دفن کر دیا ہے۔ ہم میں سے کسی کی یہ بھی ہمت نہ ہوئی کہ دوسرے کی گفتگو سننے کا ارادہ کرے، اس لیے کہ ہمارے دل کی رگیں اس قدر کمزور ہو گئی تھیں کہ گفتگو کا تو کیا ذکر، ٹھنڈا سانس بھی انہیں قطع کر دینے کے لیے کافی تھا۔

رات آدھی ہو گئی اور خاموشی کی خوفناکیاں بڑھ گئیں۔ چاند صنین کے پیچھے سے ادھورا طلوع ہوا۔ وہ تاروں کے درمیان ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کے درمیان ناتوان مردہ کا چہرہ، جو تابوت کی سیاہیوں میں غلطاں ہو۔ اور لبنان اس بوڑھے کی طرح نظر آ رہا تھا، جس کی کمر زمانہ نے جھکا دی ہو۔ جس کے جسم کو غموں نے کھا لیا ہو، جس کی آنکھوں سے نیند اُچاٹ ہو گئی ہو۔ اور وہ بیداری اور تاریکی سے اکتا کر بے چینی کے ساتھ صبح کا انتظار کر رہا ہو، اس معزول بادشاہ کی طرح، جو اپنے محل کی ویرانیوں میں اپنے تخت کی راکھ پر بیٹھا ہو۔

پہاڑ، درخت اور ندی نالے، زمانہ اور حالات کے ساتھ، اپنی وضع و ہیئت اور مقامات بدل دیتے ہیں۔ جس طرح انسان کے خدوخال، جذبات و افکار کے تغیر کے ساتھ متغیر ہو جاتے ہیں۔ چنار کا درخت، جو دن کو اس حسین دلہن کی مثال ہوتا ہے۔ جس کے لباس سے ہوا کی موجیں اٹھکھیلیاں کرتی ہیں، شام کو دھوئیں کا ستون معلوم ہوتا ہے، وہ بڑی چٹان، جو دوپہر کو

قوی ہیکل دیو کی مانند زمانہ کے حملوں کا مذاق اڑاتی ہے، رات کو اس پہ قسمت فقیر کی مثال معلوم ہوتی ہے، جس کا بچھونا زمین ہو اور اوڑھنا، فضا، اور وہ ندی، جو صبح کے وقت ہمیں پگھلی ہوئی چاندی کی طرح جگمگاتی نظر آتی ہے۔ اور جسے ہم غیر فانی گیت گاتے سنتے ہیں، شام کو ایسی معلوم ہوتی ہے۔۔ کہ آنسوؤں کی ایک نہر ہے، جو وادی کی پلیوں سے نکلی ہے، اس وقت اس کے غیر فانی گیت اس ماں کے نوحہ و ماتم میں متبدل ہو جاتے ہیں، جس کا اکلوتا بچہ مر گیا ہو۔

لبنان، جو ایک ہفتہ پہلے، جبکہ چاند، چودھویں رات کا چاند تھا اور ہماری روحیں راحت و اطمینان کا گہوارہ، رونق و جلال کی مکمل تصویر تھا، اس رات کو، دھڑکتے ہوئے بیمار دل اور حقیر و سرگراں چاند کے سامنے، غمزدہ، ناتواں اور وحشت زدہ معلوم ہو رہا تھا۔

میں رخصت ہونے کے لیے کھڑا ہوا تو محبت اور ناامیدی کے دو خوفناک سائے ہمارے درمیان کھڑے ہو گئے۔ محبت ہمارے سروں پر سایہ فگن تھی اور ناامیدی ہمارے گلے گھونٹ رہی تھی، محبت، دل سوزی کے طور پر رو رہی تھی اور ناامیدی طنز و استہزاء کے طور پر ٹھٹھے لگا رہی تھی۔

جب میں نے سلمیٰ کا ہاتھ برکت کے لئے اپنے ہونٹوں پر رکھا تو وہ میرے قریب آئی اور میری مانگ کو بوسہ دیا۔ اس کے بعد وہ پلٹی اور لکڑی کی بنچ پر جا پڑی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ آہستہ ہلکی آواز میں کہنے لگی۔

"یا رب! رحم کر، اور تمام ٹوٹے ہوئے پروں کو قوت عطا فرما!!"

سلمیٰ سے جدا ہو کر میں اس چار دیواری سے نکلا مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے حواس پر ایک کثیف پردہ پڑا ہے جیسے سمندر کی سطح پر بادل امڈ رہا تھا۔ اور درختوں کے سائے، جو سڑک کے دونوں طرف تھے، میرے سامنے اس طرح حرکت کر رہے تھے گویا غیر مرئی مخلوق کے سائے ہیں، جو مجھے خوف زدہ کرنے کے لئے زمین سے نکل آئے ہیں، چاند کی مدھم شعاعیں، شاخوں کے درمیان اس طرح لرز رہی تھیں، گویا باریک تیر ہیں، جنہیں فضا میں اڑتی ہوئی روحوں نے میرے سینے پر پیوست کر دیا ہے اور بے پناہ خاموشی مجھ پر اس طرح چھائی ہوئی تھی، گویا بھاری سیاہ ہاتھ جنہیں تاریکی نے میرے جسم پر پھیلا دیا ہے۔

اس وقت ہستی کا ہر پہلو ناگوار، زندگی کا ہر مقصد وحشت انگیز اور روح کا ہر لطیف راز ہولناک تھا۔

وہ نورِ باطن جس نے مجھے دنیا کے حسن اور کائنات کی مسرتوں سے دوچار کیا تھا اس وقت آگ میں تبدیل ہو کر اپنے شعلوں سے میرے دل کو جلا رہا تھا اور اپنے دھوئیں میں میری روح کو روپوش کر رہا تھا۔

وہ نغمہ جو کائنات کی ساری آوازوں کو اپنے میں جذب کر کے انہیں مقدس راگ بنا دیتا ہے اس وقت ایک بے معنی شور و غل میں تبدیل ہو گیا تھا جو شیر کی دہاڑ سے زیادہ خوفناک اور، دوزخ کی چیخ پکار سے زیادہ گہرا تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں بستر پر گر پڑا جیسے کوئی پرندہ شکاری کے تیر کھا کر کسی چار دیواری میں گر پڑے اور تڑپ کر اس کے دل میں تیر پیوست ہو جائے

رات میں نے خوفناک بیداری اور پریشان خوابی میں گذار دی لیکن میری روح ہر حالت میں سلمیٰ کے ان فقروں کو دہرا رہی تھی۔

"یارب رحم کر اور ٹوٹے ہوئے پردل کو قوت عطا فرما!!"

(۸)

موت کے دربار میں

ہمارے زمانہ میں، شادی ایک قسم کی تجارت ہو گئی ہے جو مضحکہ خیز بھی ہے اور ماتم انگیز بھی۔ یہ کاروبار، نوجوانوں اور لڑکی کے والدین کے درمیان ہوتا ہے، نوجوان اکثر ملکوں میں، اس تجارت سے فائدہ اُٹھاتے ہیں اور والدین ہمیشہ ٹوٹے میں رہتے ہیں۔ لیکن وہ لڑکیاں، جو سامان تجارت کی طرح ایک گھر سے دوسرے گھر میں منتقل ہوتی ہیں، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی مسرتوں سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں، پرانے کاٹھ کباڑ کی طرح، ان کی تقدیر میں گھر کے کونے کھدرے ہوتے ہیں جہاں وہ تاریکی اور کس مپرسی کے عالم میں گھل گھل کر جان دیدیتی ہیں۔

موجودہ تمدن نے عورت کا درجہ کچھ بڑھا دیا ہے، لیکن مردوں کے جذبات حرص و طمع کو عام کر کے اس کے درد و کرب میں اس سے کہیں زیادہ اضافہ کر دیا ہے۔ عورت کل تک ایک خوش نصیب خادمہ تھی لیکن آج کرموں پھوٹی بیگم ہے کل تک وہ اندھی تھی، اور دن کی روشنی میں چلتی پھرتی تھی، لیکن آج وہ آنکھوں والی

ہے، اور رات کی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھاتی ہے کل تک وہ اپنے جہل کی وجہ سے جن تیغ القرون کی وجہ سے ممتاز اور اپنی کمزوری کی وجہ سے قوی تھی۔ لیکن آج وہ اپنی نیرنگیوں کی بنا پر کٹ کھائی، وہ اپنے تصورات کی بنا پر اُلجھی اور اپنی عقل آرائیوں کی بنا پر ذلیل ہے گو سب سے دور ہے۔

کیا کوئی دن ایسا بھی آئے گا جب عورت میں حسن کے ساتھ سمجھ بوجھ، نیرنگیوں کے ساتھ عظمت و امتیاز اور جسمانی کمزوری کے ساتھ روحانی قوت بھی ہوگی؟

میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو اس بات کے قائل ہیں کہ روحانی ارتقاء صفت بشری ہے، اور قرب کمال سست مگر موثر قانون ہے۔ میرے خیال میں اگر عورت ایک چیز میں ترقی کرے گی تو دوسری چیز میں پیچھے رہ جائے گی، اس لئے کہ وہ گھاٹیاں ہیں جن کو طے کر کے ہم پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے ہیں، بھیڑیوں اور شیروں کا مسکن بھی ہوتی ہیں۔

دورِ حاضر جو نیند اور بیداری کی درمیانی حالت سے مشابہ ہے جس کے ہاتھ کی گرفت میں گذرے ہوئے زمانہ کی زمین اور آنے والے زمانہ کے بیج ہیں اور جسے رجحانات و میلانات کے اعتبار سے انوکھا کہا جا سکتا ہے اپنے دامنِ تہذیب میں کچھ ایسی عورتیں بھی رکھتا ہے جن کا وجود آنے والی عورتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

بیروت میں سلمیٰ جسے ہم مستقبل کی عورت کا نمونہ کہہ سکتے تھے، لیکن بہت سے لوگوں کی طرح جو وقت سے پہلے پیدا ہو کر زمانہ کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں وہ بھی اُن پھولوں کی طرح جسے دریا کا دھارا بہائے چلے، طوعاً و کرہاً بدبختی کا شکار ہوگئی۔

منصور بک کی شادی سلمیٰ سے ہوگئی، وہ دونوں بیروت کے بہترین علاقے میں جہاں شہر کے ثروت مند لوگ چین سے رہا کرتے تھے ایک شاندار مکان میں زندگی بسر کرنے لگے اور فارس کرامی اپنے مکان

اس طرح تنہا رہ گیا جیسے بھیڑوں میں چرواہا!

شادی کے دن مسرت کی راتوں کے ساتھ گذر گئے اور وہ مہینہ بھی جسے دنیا "ماہ عسل" کے نام سے پکارتی ہے اپنے پیچھے سرکہ اور اندرائن جیسے کڑوے کسیلے تجربے چھوڑ کر گذر گیا جس طرح بڑی بڑی جنگیں مقتولوں کی قبریں بیوؤں کی یادگار کے طور پر چھوڑ جاتی ہیں۔

مشرقی شادیوں کی مسرت، نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو لمحہ کی سی تیزی کے ساتھ، بادلوں کی دنیا میں اڑا لے جاتی ہے اور وہاں سے انہیں زمین پر پھینک دیتی ہے، جس طرح چکی کا پاٹ سمندر میں پھینکا جائے۔ بلکہ یہ مسرت، ان نقش قدم کی مثل ہوتی ہے جو ریگ ساحل پر ہوں اور جنہیں سمندر کی موجیں چشم زدن میں مٹا دیں۔

موسم بہار گذر گیا، گرمیاں ختم ہوئیں اور خزاں آ پہنچی۔ سلمیٰ سے مجھے جو محبت تھی وہ اب اس عشق کے درجے سے نکل کر جو ایک نوجوان کو شباب کے پر فسوں دور میں کسی حسین لڑکی سے ہوتا ہے، اس عبادت خاموش کی حد تک پہنچ گئی جو ایک یتیم بچہ اپنی مری ہوئی ماں کی روح کے لئے محسوس کرتا ہے، وہ میرا شباب، جو مجھ پر آندھی کی طرح مسلط تھا، اب اس نے ایک ایسے ندامت و غم کی صورت اختیار کرلی، جو اپنے سوا کسی کو بھی نہیں دیکھتی، جو میری آنکھوں سے آنسو بہاتا تھا اب ایک ایسے رنج میں تبدیل ہو گیا جو جگر اور دل سے خون نچوڑتا تھا، اور جذبہ محبت کی وہ فریاد، جس سے میرا کلیجہ پھٹا جاتا تھا، اب دعا میں بدل گئی، جو میں سلمیٰ کی خوش نصیبی، اس کے شوہر کی راحت و مسرت، اور اس کے باپ کے سکون و اطمینان کے لئے، راتوں کی خاموشی میں، خدا سے مانگا کرتا تھا، لیکن میری تمام التجائیں اور دعائیں سب بیکار ثابت ہوئیں اس لئے کہ سلمیٰ کی بدقسمتی، اس کے نفس

سلمیٰ کی موت

کی بیماری تھی جس کا موت کے سوا کوئی علاج نہ تھا، رہا اس کا شوہر سو وہ اُن لوگوں میں تھا جو بغیر کسی محنت و مشقت کے زندگی کی مسرتوں کو حاصل کر لیتے ہیں، لیکن ان پر قناعت نہ کر کے ہمیشہ ایسی چیزوں کا لالچ کرتے ہیں جو ان کے لئے نہیں ہوتیں اور اس طرح اپنی حرص و طمع کی بنا پر تمام عمر تکلیف میں مبتلا رہتے ہیں۔

ناظرین کرام کے سکون و اطمینان کے لئے بھری اُمید پر لاد تمنائیں اس لئے عبث تھیں کہ اُس کے داماد نے کبھی اس کی بیٹی کے ہاتھ کو بوسہ نہیں دیا، وہ اپنی بیوی کے مال و متاع پر قابض ہو کر اپنے خسر کو بھول گیا یہی نہیں بلکہ اُس کی موت کا طالب رہنے لگا تاکہ بچی کھچی دولت پر بھی قبضہ کرے۔

منصور اپنے چچا پادری کا چہیتا تھا، اُس کے اخلاق و عادات بالکل اپنے چچا کے اخلاق و عادات سے مشابہ تھے، ان دونوں میں اگر کوئی فرق تھا تو صرف اتنا کہ پادری ریاکار تھا اور منصور کھلا ہوا بدمعاش، پادری اپنے مقدس لباس کے پردہ میں کھل کھیلتا اور اپنی مذہبی حیثیت کے سایہ میں اپنی حرص و آز کی تسکین کا سامان فراہم کرتا جو اس کے سینہ پر لگی رہتی تھی، لیکن اس کا بھتیجہ یہ سب کچھ کرتا اور علی الاعلان کرتا، پادری صبح کو گرجا میں جاتا اور وہاں، سارے دن، بیواؤں، یتیموں اور سادہ دل لوگوں کا مال غصب کرتا، لیکن منصور اپنی خواہشوں سے لذت اندوز ہونے کے لئے سارے دن، اُن تنگ و تاریک گلیوں میں مارا مارا پھرتا، جن کی فضا بدکاروں اور اوباشوں کے مکروہ سانسوں سے گندی رہتی، پادری ہر اتوار کو قربان گاہ کے سامنے کھڑے ہو کر اہلِ ایمان کو اُن باتوں کی نصیحت کرتا جن پر خود کبھی عمل نہ کرتا، اور ہفتہ کے باقی دن، مقامی سیاست میں مشغول رہ کر گذارتا

لیکن اس کا بھتیجا ہر روز اپنے چچا کے اثر و نفوذ سے فائدہ اٹھا کر ملازمت کے محتاجوں اور عزت اور اقتدار کے بھوکوں میں کاروبار کرتا، پادری چور تھا، جو رات کے پردوں میں چھپ کر چوری کرتا، لیکن منصور دھاڑی تھا جو دن دہاڑے ڈاکیں مارتا۔

اس طرح قومیں ان مقدس چوروں اور دغابازوں کے درمیان ہلاک ہوتی ہیں جیسے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ، بھیڑیوں کے دانتوں اور قصائیوں کی چھریوں کے درمیان! اور اس طرح مشرقی قومیں ان بدفطرت و بد اخلاق لوگوں کے پھندوں میں پھنس کر الٹے پاؤں چلتی اور گڑھے میں گر پڑتی ہیں اس وقت زمانہ انہیں اپنے پاؤں سے پیس دیتا ہے جس طرح لوہے کے ہتوڑے مٹی کے برتنوں کو چکنا چور کر دیتے ہیں۔

لوگو! میں ان صفحات میں بدقسمت و مایوس قوموں کا ذکر کیوں کر رہا ہوں؟ جبکہ میں نے انہیں ایک بدنصیب عورت کی داستان حیات اور اس غم زدہ دل کے خیالات کی عکاسی کے لئے مخصوص کیا تھا جسے محبت نے کبھی اپنی مسرتوں سے نہیں نوازا، بلکہ اپنے غم کے تھپیڑوں سے ادھ موا کر دیا، میری آنکھیں گمنام و مظلوم قوموں کے ذکر سے کیوں اشک آلود ہو رہی ہیں؟ حالانکہ میں نے اپنے آنسو اس کمزور عورت کی سرگذشت زندگی کیلئے وقف کئے تھے، جو زندگی سے بغلگیر نہ ہونے پائی تھی کہ موت نے اسے اپنے آغوش میں لے لیا۔ لیکن کیا کمزور عورت کا وجود، قوم کی مظلومیت پر دلالت نہیں کرتا؟ کیا وہ عورت، جو روحانی میلانات اور جسمانی قیدوں کے درمیان مبتلائے درد ہو، اس قوم کی مثال نہیں ہوتی جو حاکموں اور مذہبی اجارہ داروں کے درمیان مبتلائے عذاب ہو؟ کیا وہ پوشیدہ

جذبات جو ایک حسین اور نوجوان لڑکی کو قبر کی تاریکیوں میں پہنچا دیتے ہیں اُن شدید طوفانوں جیسے نہیں ہوتے جو حیاتِ قومی کو خاک میں ملا دیتے ہیں؟ عورت قوم کے لئے وہی حیثیت رکھتی ہے جو چراغ کے لئے اُس کی لَو، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ چراغ میں تیل بھی کم نہ ہو اور اُس کی لَو بھی ٹمٹمائے؟

بادِ خزاں کے شدید جھونکوں نے، زرد پتوں سے کھیل کھیل کر، جس طرح طوفان کفِ سمندر سے کھیلتا ہے، درختوں کو ننگا بوچا کر دیا تھا۔ آخر کار موسمِ خزاں بھی گذر گیا اور موسمِ سرما روتا پیٹتا اور آہ و فریاد کرتا آیا۔ اس وقت میں بیروت میں تھا اور ان خیالوں کے علاوہ میرا کوئی رفیق نہ تھا، جو کبھی میری روح کو اتنا اُبھارتے تھے کہ وہ تاروں کی دُنیا میں پہنچ جاتی تھی اور کبھی میرے دل کو اتنا پست کرتے تھے کہ وہ تحت الثریٰ سے ہم سطح ہو جاتا تھا۔

غمگین روح عزلت و تنہائی میں راحت پاکر دُنیا سے بے تعلق ہو جاتی ہے، جس طرح زخمی ہرن ڈار سے الگ ہو کر کسی غار میں جا چھپتا ہے، یہاں تک کہ اچھا ہو جائے یا مر جائے۔

ایک دن فارس کرامہ کی بیماری کی خبر سن کر میں نے تنہائی کو خیرباد کہا، اور اس کی عیادت کے لئے چل کھڑا ہوا اور شارعِ عام سے ہٹ کر، جہاں گاڑیوں کی ریل پیل اور گاڑیوں کی آوازیں فضا کے سکون کو برباد کر دیتی ہیں، میں نے اپنے لئے وہ سنسان سڑک منتخب کی جہاں دو رویہ زیتون کے درختوں کی رصاصی پتیوں پر بارش کے قطرے چمک رہے تھے۔

فارس کرامت کی کوٹھی پر پہنچکر جب میں اُس کے کمرہ میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ بستر علالت پر دراز ہے جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے، چہرہ بالکل سُت گیا ہے رنگ پیلا پڑ گیا ہے۔ آنکھیں اندر کی طرف دھنس گئی ہیں اور ایسی معلوم ہو رہی ہیں جیسے دو تاریک اور گہرے غار ہیں، جن میں دُکھ بیماری کی پرچھائیاں متحرک ہیں۔ وہ چہرہ جو کل تک شگفتگی اور مسرت کا عنوان تھا، جھریاں پڑ کر اور سیاہ ہو کر ایسا ہو گیا ہے جیسے خاکستری رنگ کا مڑا تڑا کاغذ جس پر بیماری عجیب اور مشتبہ عبارت لکھ رہی ہے اور وہ ہاتھ جو نرم و نازک تھے، اس قدر سوکھ گئے تھے کہ جلد کے نیچے انگلیوں کی ہڈیاں نمایاں ہو گئی تھیں، گویا یہ برگ و بار شاخیں موج ہوا کے سامنے کانپ رہی ہیں۔

جب میں مزاج پرسی کے لئے اُس کے قریب گیا تو اُس نے اپنا رخ میری طرف کیا، اُس کے کانپتے ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسم نمودار ہوا، اور اتنی کمزور آواز میں گویا کوئی دیوار کے پیچھے سے گفتگو کر رہا ہے، اُس نے کہا:

"بیٹا! سامنے والے کمرہ میں جاؤ اور سلمیٰ کے آنسو پونچھو، اُسے تسلی دے کر یہاں لاؤ کہ وہ کچھ دیر میرے پاس بیٹھے!"

جب میں سامنے والے کمرہ میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا سلمیٰ ایک صوفہ پر تکیوں میں منہ دیئے پڑی ہے۔ اُس کی کلائیاں اُس کے سر پر بندھی ہیں اور وہ سسکیوں سے رو رہی ہے، تاکہ اس کا باپ اُس کے گریہ و ماتم سے آگاہ نہ ہو۔ میں آہستہ آہستہ اُس کے پاس گیا اور ایسی آواز میں اُس کا نام لے کر پکارا جو سرگوشی سے زیادہ ٹھنڈے سانس سے قریب تھی، بے چین ہو کر وہ اُٹھی جیسے کوئی ڈرے

والا، پریشان خواب سے چونک اُٹھا ہو، اور گری پہ سنبھل کر بیٹھ گئی، اُس نے مجھے اس طرح ٹکٹکی باندھ کر دیکھا گویا وہ عالمِ خواب میں کسی سائے کو دیکھ رہی ہے اور اُسے یقین نہیں آتا کہ میں وہاں موجود ہوں۔

ایک گہرے سکوت کے بعد ــــ جس نے اپنی سحر آگین تاثیر سے ہمیں اُن لمحات کی طرف لوٹا دیا تھا جن میں ہم نے آسمانی شراب پی تھی ــــ سلمیٰ نے اپنی آستین سے آنسو پونچھے اور حسرت آمیز لہجہ میں کہنے لگی:

"تم نے دیکھا، دنیا نے کیسا پلٹا لیا ہے؟ تم نے دیکھا زمانہ نے ہمیں کس طرح گمراہ کیا ہے اور ہم کتنی جلدی ان ڈراونے غاروں میں گرے ہیں؟ اس جگہ، موسم بہار نے محبت کے سایہ میں ہم دونوں کو یکجا کیا تھا اور اسی جگہ موسم سرما نے ہم دونوں کو موت کے دربار میں کھڑا کر دیا۔ آہ! کس قدر خوش گوار اور حسین تھا وہ دن اور آہ! کس قدر شدید اور ہولناک ہے اس رات کی تاریکی!!!"

آخری الفاظ سلمیٰ کے حلق میں اٹک کر رہ گئے، وہ مڑی اور اپنے چہرہ کو ہاتھوں سے چھپا لیا گویا ماضی کے واقعات مجسّم ہو کر اُس کے سامنے کھڑے ہیں۔ اور وہ انہیں دیکھنا نہیں چاہتی۔ میں نے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور کہا:

"آؤ سلمیٰ!! ــــ آؤ ہم گولے کے سامنے، بُرجوں کی طرح کھڑے ہو جائیں۔ آؤ، ہم محرزمیوں کے مقابلہ میں فوج کی صورت ڈٹ جائیں اور تلوار کے ہاتھ اپنی پیٹھ پر نہیں اپنے سینہ پر روکیں، اگر ہمیں شکست ہوئی تو ہم شہیدکی موت مریں گے، اور اگر ہم نے فتح پائی، تو غازیوں کی زندگی بسر کریں گے، تکلیفوں اور دشواریوں کا استقلال و استقامت کے ساتھ مقابلہ کرنا، اس سے کہیں بہتر ہے کہ آدمی امن و سکون کے لئے

بھاگ کھڑا ہو، وہ پتنگا جو چراغ کے گرد چکر لگاتا اور انجام کار جل مرتا ہی، اُس بچھو ندر سے کہیں افضل ہی، جو راحت و سلامتی کے ساتھ تاریک بل میں رہتی ہی۔ وہ بیج جو جاڑے کی سردی اور عناصر کی برانگیختگی کی تاب نہیں لا سکتا، زمین کا سینہ چیر کر بہار کی حسن آرائیوں سے فرحت اندوز نہیں ہو سکتا۔ آؤ سلمیٰ! ہم اس ناہموار راستہ کو ثابت قدمی کے ساتھ طے کریں، اس طرح کہ ہماری آنکھیں سورج کی طرف ہوں تاکہ ہم چٹانوں کے درمیان پڑی ہوئی مردہ کھوپڑیوں اور گھاس پھونس میں رینگتے ہوئے سانپوں کو نہ دیکھ سکیں۔ سلمیٰ اگر ہم راستہ میں خوف کی وجہ سے کہیں رُک گئے، تو رات کی تاریکیاں ہمارا مذاق اُڑائیں گی، اور اگر ہم ہمت و شجاعت سے کام لے کر چوٹی پر پہنچ گئے، تو فضائے بسیط میں منتشر روحیں ہمارے ساتھ نصرت و کامیابی کے گیت گائیں گی۔ سلمیٰ صبر کرو، آنسو پونچھو، اپنے چہرہ سے غم کو نمایاں نہ ہونے دو، اُٹھو اور اپنے والد کے پاس چل کر بیٹھو، اُن کی زندگی تمہاری زندگی پر منحصر ہے اور اُن کی شفا تمہارے تبسم پر ہے!"

سلمیٰ نے مجھ پر شوق اور محبت کی نگاہ ڈالی اور کہا:

"تم مجھ سے صبر و سکون چاہتے ہو حالانکہ تمہاری آنکھیں خود یاس و ناامیدی کا اظہار کر رہی ہیں۔ کیا ایک بھوکا فقیر اپنی روٹی کسی دوسرے بھوکے فقیر کو دے سکتا ہی، کیا ایک بیمار دوسرے بیمار کو دوا دے سکتا ہی جبکہ وہ اس سے زیادہ دوا کا محتاج ہو؟"

وہ اُٹھی اور سر جھکائے، میرے آگے آگے اپنے والد کے کمرہ کی طرف روانہ ہو گئی۔

ہم دونوں بیمار بوڑھے کے بستر کے پاس بیٹھ گئے، سلمیٰ بہ تکلف اپنے آپ کو

سنبھالنے اور مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی اور فارس کرامہ یہ ظاہر کرنے کی، کہ میں راحت و قوت سے ہمکنار ہوں، حالانکہ دونوں کو ایک دوسرے کی تکلیف کا احساس تھا، دونوں ایک دوسرے کی کمزوری سے واقف تھے اور دونوں ایک دوسرے کی دل کی دھڑکن سن رہے تھے۔ وہ دونوں اُن دو مائل قوتوں کی مثال تھے، جو خاموشی کے عالم میں ایک دوسرے کو فنا کر دیتی ہیں۔ بیمار باپ اپنی بیٹی کی بدقسمتی کے غم میں گھلا جا رہا تھا اور محبت کرنے والی بیٹی، اپنے باپ کی بیماری کے رنج میں تمام ہوئی جا رہی تھی اور میں، اُن دونوں کے درمیان اپنی تکلیفوں کو برداشت اور اُن کی مصیبتوں کو محسوس کر رہا تھا۔

قسمت نے تین آدمیوں کو یکجا کیا اور پھر انہیں اس طرح دبا کر بے بس کر رہ گئی ——— ایک بوڑھا جو اس پرانی عمارت کی مثال تھا جسے طوفان باد و باراں نے منہدم کر دیا ہو ——— ایک دوشیزہ، جو اس پھول سے مشابہ تھی، جسے درانتی سے کاٹ ڈالا گیا ہو ——— اور ایک نوجوان جو اس کمزور پودے سے مماثل تھا جسے برفباری نے دوہرا کر دیا ہو، گویا ہم تینوں زمانہ کی انگلیوں میں تین کھلونے تھے۔

فارس کرامہ نے حرکت کی اور اپنا کمزور ہاتھ سلمیٰ کی طرف بڑھایا اور ایسی آواز میں، جو باپ کے دل کی شفقت و رقت اور بیمار کے سینے کے دکھ درد کی حامل تھی، اُس سے کہا:۔

"سلمیٰ اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھو!"

سلمیٰ نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اپنے باپ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ فارس کرامہ نے آہستہ سے اُس کا ہاتھ دبایا اور کہنے لگا:

"میری بچی! اب زندگی سے میں سیر ہو گیا ہوں، میں بہت دن جیا اور میں نے زندگی کے ہر خوشگوار پہلو سے خوب جی بھر کے لطف حاصل کیا، میں نے بچپن کھیل کود میں، جوانی عشق و محبت میں، اور بڑھاپا مال و دولت جمع کرنے میں گزارا، یہ تینوں دور میں نے خوشحالی اور خوش بختی میں بسر کئے...... سلمیٰ! تو ابھی تین برس کی بھی نہ ہوئی تھی کہ تیری ماں مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی، لیکن تجھے میرے لئے ایک بے بہا خزانہ کے طور پر چھوڑ گئی۔ میں نے تجھے پالا اور تو ہلال کی طرح تیزی سے پروان چڑھنے لگی، تیرے چہرے سے، تیری ماں کے خدوخال اس طرح منعکس ہونے لگے، جیسے ٹھہرے ہوئے پانی میں ستاروں کی شعاعیں، اور تیرے قول و فعل میں، اس کے اخلاق و محاسن اس طرح ظاہر ہونے لگے جیسے باریک نقاب میں سے سونے کے زیورات! میری بچی، تیرا وجود میرے لئے وجہ تسلی تھا، اس لئے کہ تو اپنی ماں کی طرح حسین اور عقلمند تھی، اور اب کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں، میرے لئے راحت و سلامتی موت کے نرم و نازک بازوؤں میں ہے!

بیٹی! میرے اطمینان کے لئے کافی ہے کہ میں تجھے ایک الھڑ نوجوان لڑکی نہیں، بلکہ ایک سنجیدہ عورت چھوڑ کر مر رہا ہوں، مجھے خوشی ہے کہ مرنے کے بعد بھی تیری وجہ سے زندہ رہوں گا۔ سلمیٰ! پھر کیا ہے؟ آج مرا تو، اور کل یا اس کے بعد مرا تو، اس لئے کہ میری زندگی اُن خزاں زدہ پتوں کی مانند ہے جنہیں ہوائے خزاں سے جدا کر کے زمین پر منتشر کر دیتی ہے! زمانہ مجھے جلد سے جلد دوسرے عالم میں پہنچا دینا چاہتا ہے، وہ جانتا ہے کہ میری روح

تیری ماں کے دیدار کی بے انتہا مشتاق ہے!!"

آخری الفاظ، فارس کرامت نے اس نغمہ آگیں لہجہ میں ادا کیے جو شوق و امید کی حلاوت سے لبریز تھا، اس کے افسردہ چہرہ پر ایک ایسی چمک پیدا ہوئی، جو معصوم بچے کی آنکھوں کے نور سے مشابہ تھی۔ اس نے اپنے سرہانے سے ایک چھوٹی سی سنہری تصویر نکالی جس کے کنارے انگلیوں کی رگڑ سے گھس گئے تھے اور نقوش بوسوں سے مدھم پڑ گئے تھے۔ تصویر سے اپنی نگاہیں ہٹائے بغیر اس نے کہا:

"سلمیٰ! میرے پاس آ!! میں تجھے تیری ماں کی تصویر دکھاؤں!! بیٹی!! آ، اور کاغذ پر اپنی ماں کا عکس دیکھ!!"

سلمیٰ آستین سے آنسو پونچھتی ہوئی آگے کی طرف جھکی، اس خیال سے کہ آنسو کہیں اس کے اور اس کی ماں کی تصویر کے درمیان حائل نہ ہو جائیں، وہ تصویر کو دیر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی گویا وہ ایک آئینہ ہے جس میں وہ چہرہ کے علاوہ اپنی معنوی زندگی کا عکس بھی دیکھ رہی ہے۔ اس نے تصویر کو اپنے ہونٹوں سے لگایا اور غمگین بوسوں کا تار باندھ دیا، وہ چلائی:

"امّاں! امّاں!! امّاں!!!

اس کے علاوہ اس کی زبان سے کچھ نہ نکلا، وہ مڑی اور تصویر کو پھر اپنے کانپتے ہونٹوں سے لگا لیا، گویا اپنے گرم سانسوں سے اس میں زندگی کی حرارت پیدا کرنی چاہتی ہے۔

انسان کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے الفاظ میں، سب سے زیادہ شیریں لفظ "ماں" ہے اور سب سے زیادہ حسین منادی "اے ماں!" یہ چھوٹا سا کلمہ

اپنے معنی کے اعتبار سے بہت وسیع ہے، جس میں اُمید و محبت اور نزاکت و حلاوت سب کچھ شامل ہے۔ ماں ہی دنیا میں ہمارے لئے سب کچھ ہے۔ وہ تنہائی میں ہماری رفیق، نااُمیدی میں ہمارا سہارا، اور کمزوری میں ہماری قوت ہے ——
وہ رحم و کرم اور لطف و بخشش کا سرچشمہ ہے۔ اس لئے اگر کسی کی ماں نہ رہی، تو وہ سینہ نہ رہا جس پر وہ اپنا سر ٹکاتا ہے، وہ ہاتھ نہ رہے جنھیں وہ احتراماً بوسہ دیتا ہے اور وہ نگاہیں نہ رہیں جو اس کی نگرانی کرتی ہیں۔

سلمیٰ اپنی ماں سے بالکل ناآشنا تھی، اس لئے کہ وہ اسے تین برس کی چھوڑ کر مر گئی تھی۔ لیکن جب اس نے اپنی ماں کی تصویر دیکھی تو بے چین ہو گئی اور غیر اختیاری طور پر اس کی زبان سے نکلا

"ہائے! امّاں!!"

ماں کا لفظ ہمارے دلوں میں اس طرح پوشیدہ ہوتا ہے، جیسے بیج، زمین کے سینہ میں، اور رنج و راحت کی گھڑیوں میں ہمارے ہونٹوں سے اس طرح ادا ہوتا ہے، جیسے صاف اور معطر فضا میں گلاب کی پتیوں سے خوشبو پھوٹتی ہے۔

سلمیٰ کبھی اپنی ماں کی تصویر کو غور سے دیکھتی، اور کبھی بے قرار ہو کر اُسے چومتی کبھی اُسے اپنے دھڑکتے ہوئے دل سے لگاتی اور کبھی ٹھنڈا سانس بھر کر آہ کھینچتی، ہر ٹھنڈے سانس کے ساتھ اُس کی قوتوں کا کچھ نہ کچھ حصہ ختم ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب اُس کے دُبلے پتلے جسم میں زندگی کی قوت کمزور ہونے لگی تو وہ نڈھال ہو کر اپنے بیمار باپ کے پلنگ کے پاس گر پڑی۔

فارس کرامہ نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھے اور کہا:

"بیٹی! تم نے اپنی ماں کی تصویر تو دیکھ لی، اب اس کی خوبیاں بھی سنو!!"
سلمیٰ نے اپنا سر اٹھایا، جس طرح پرندوں کے بچے، مقید چڑیا کی پھڑپھڑاہٹ کی آواز سن کر اپنے اپنے آشیانوں سے سر نکالتے ہیں اور سراپا چشم و گوش ہوگئی۔
فارس کرامر نے کہنا شروع کیا:
"بیٹی! جب تیرے نانا کا انتقال ہوا ہے، تو وہ بیٹی ہی تھی، تیری ماں کو اپنے باپ کے مرنے کا بہت صدمہ ہوا اور وہ روتی پیٹی بھی، مگر صبر اور دانشمندی کے ساتھ، چنانچہ اس سے پہلے کہ مرنے والے کو دفن کرتے، وہ اسی کمرہ میں میرے پاس آکر بیٹھی اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگی: فارس! میرا باپ اللہ کو پیارا ہوا، مگر تم میرے لئے موجود ہو اور یہی میری تسلی کے لئے کافی ہے! اس لئے کہ وہ دل، جو گوناگوں جذبات کا حامل ہو، دیودار کے اس درخت سے مشابہ ہوتا ہے جس کی بہت سی شاخیں ہوں، چنانچہ دیودار کے درخت کی اگر کوئی مضبوط ٹہنی ٹوٹ جاتی ہے تو اسے رنج ضرور ہوتا ہے لیکن وہ اس کے غم میں سوکھتا نہیں، بلکہ اس کی قوت نمو قریبی شاخ کے نشو و نما میں صرف ہو جاتی ہے اور وہ دوسری ہری بھری ٹہنیوں سے ٹوٹی ہوئی شاخ کی جگہ پُر کر لیتا ہے!"
سلمیٰ! اپنے باپ کے انتقال کے بعد تیری ماں نے یہ الفاظ کہے تھے، تجھے بھی چاہیئے کہ جب موت میرے جسم کو قبر کے حوالہ کردے اور میری روح کو اللہ کی حفاظت میں پہنچا دے تو اسی قسم کے الفاظ تیری زبان سے بھی ادا ہوں!"
سلمیٰ نے دردناک لہجہ میں جواب دیا:
"باپ کے انتقال کے بعد میری ماں کے لئے آپ تھے، لیکن خدانخواستہ

آپ کے بعد میرا کون ہے؟ اُن کے باپ مرے تو وہ ایک شریف مقتدر اور محبت کرنے والے شوہر کے سایہ میں تھیں ـــــ اُن کے باپ مرے تو ایک بچی اُن کی گود میں تھی جس کا سر اُن کے سینہ کی ٹھنڈک اور جس کی ننھی ننھی کلائیاں اُن کے گلے کا ہار تھیں لیکن آپ کے بعد میرے لئے کیا ہے؟ ابا جان! آپ ہی میرے باپ ہیں اور آپ ہی میری ماں، آپ ہی میرے بچپن کے رفیق ہیں اور آپ ہی میری جوانی کے مربی، اگر آپ مجھ سے جدا ہو گئے تو آپ کا بدل میں کہاں سے لاؤں گی!!"

یہ کہکر سلمیٰ نے اشک آلود نگاہوں سے مجھے دیکھا اور میرا دامن پکڑ کر کہنے لگی،

ابا جان! ان کے سوا میرا کوئی دوست نہیں اگر آپ مجھے چھوڑ کر چلے گئے تو ان کے سوا میرا کوئی سہارا نہیں۔ لیکن کیا یہ میری تشفی کر سکیں گے جب کہ یہ خود میری طرح غم زدہ ہیں؟ کیا کوئی دل شکستہ، لوٹے ہوئے دل کے لئے وجہ تسلی ہو سکتا ہے؟ ابا جان! ایک قسمت کا مارا، اپنے ہمسایہ کے غم سے مطمئن نہیں ہو سکتا جس طرح کبوتر ٹوٹے ہوئے پروں کے سہارے پرواز نہیں کر سکتا......

یہ میرے مونس و دمساز ہیں، لیکن میں نے اپنے غموں سے انھیں اس قدر گراں بار کر رکھا ہے کہ اُن کی کمر دوہری ہو گئی ہے اور میرے آنسوؤں نے اُن کی بصارت کو اس درجہ زائل کر دیا ہے کہ یہ تاریکی کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکتے۔ یہ میرے بھائی ہیں میں انھیں چاہتی ہوں اور یہ مجھ سے محبت کرتے ہیں لیکن دنیا کے اور بھائیوں کی طرح، یہ میری مصیبت میں شریک تو ہوتے ہیں، مگر اس میں تخفیف نہیں کر سکتے، گریہ و ماتم میں میرا ساتھ تو دیتے ہیں لیکن میرے آنسوؤں کی تلخی اور میرے دل کی جلن میں کچھ اور اضافہ کر دیتے ہیں"

سلمیٰ کی گفتگو سن کر میرے جذبات بھڑک اٹھے تھے اور میرا سینہ تنگ سے

تنگ تر ہوتا جا رہا تھا یہاں تک کہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری پسلیاں پھٹ کر، حلق و دہان، بن گئی ہیں۔ لیکن فارس کرامہ اپنی بیٹی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا کمزور جسم آہستہ آہستہ گدوں اور تکیوں میں تحلیل ہو رہا تھا اور اس کی تھکی ماندی روح اس طرح لرز رہی تھی جیسے ہوا کے سامنے چراغ کی لو! اس نے اپنے دونوں بازو پھیلائے اور رندھی ہوئی آواز میں کہنے لگا:

"بیٹی! مجھے اطمینان سے مرنے دے! میری آنکھیں بادلوں کی دنیا کا نظارہ کر رہی ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ انھیں ان تاریک غاروں کی طرف پھیروں! ...... مجھے اڑنے دے، میرے بازوؤں نے زندگی کے قفس کی تیلیاں توڑ دی ہیں! ...... سلمیٰ! تیری ماں مجھے بلا رہی ہے، مجھے نہ روک! ...... وہ دیکھ! باد موافق چل رہی ہے اور سمندر کی سطح بادلوں سے صاف ہو گئی ہے۔ جہاز نے اپنے لنگر اٹھا دئیے ہیں اور چلنے کے لئے تیار ہے، اللہ اس کے پتواروں کو نہ توڑ! سلمیٰ! میرے جسم کو قبر میں سونے والوں کے ساتھ آرام کرنے دے اور میری روح کو جاوداں بیداری کی آغوش میں جانے دے!! صبح کے آثار ہویدا ہو گئے ہیں اور خواب ختم ہونے کو ہے...... بیٹی! اپنی روح سے میری روح کو بوسہ دے ـــ امید و رجا کے لبوں سے مجھے چوم! میرے جسم پر رنج و غم کے تلخ قطرے نہ ٹپکا ورنہ سبزہ و گل اس کے عناصر کو اپنی غذا نہ بنا سکیں گے! میرے ہاتھوں کو یاس و نومیدی کے آنسوؤں سے تر نہ کر، ورنہ میری قبر پر یہ آنسو ببول کے کانٹے بن کر اگیں گے۔ اور اپنی الم انگیز آہوں سے میری پیشانی پر کچھ نہ لکھ،

کیونکہ نسیم سحر جب میرے پاس سے گذرے گی اور اُسے دیکھے گی تو میری ہڈیوں کے غبار کو سرسبز و شاداب نزہت گاہوں میں لے جائے گی ...... میری بچی میں زندگی بھر تجھ سے محبت کرتا ہوں اور مرنے کے بعد بھی تجھی کو چاہوں گا، میری روح ہر وقت تیری حفاظت و نگرانی کے لئے تیرے ساتھ رہے گی۔"

اب فارس کرامہ میری طرف متوجہ ہوا۔ اُس کی آنکھیں کچھ کچھ بند ہو چلی تھیں اور زرد خاکستری خط معلوم ہو رہی تھیں! ایسی حالت میں کہ موت کی خاموشی اُس کی قوتِ گویائی کو مغلوب کر رہی تھی، اُس نے کہا:

"بیٹا! تم سلمیٰ کے ساتھ وہی برادرانہ سلوک روا رکھنا، جو تمہارے باپ کا میرے ساتھ تھا۔ غم کی گھڑیوں میں اُس کی رفاقت کرنا اور زندگی بھر اُس کے دوست رہنا۔ اُسے غمگین نہ ہونے دینا، اس لئے کہ مُردہ پر رونا، ماضی کی غلطیوں میں سے ایک غلطی ہے، اسے زندگی کے نغمے اور راحت و انبساط کے قصے سنا کر کوشش کرنا کہ یہ مجھے بھول جائے۔"

فارس کرامہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ اُس کے الفاظ کی پرچھائیاں کمرہ کی دیواروں پر رینگ رہی تھیں۔ اُس نے نگاہ اُٹھائی اور بیک وقت مجھے اور سلمیٰ کو دیکھا۔ باریک آواز میں اُس نے کہا۔

"اب حکیم کو بُلانے کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنی دواؤں سے میری میعادِ قید میں اضافہ کرے۔ بندگی اور غلامی کا زمانہ ختم ہو گیا اور اب میری روح آزادی کی فضا میں پرواز کرنا چاہتی ہے .... پادری کو بھی اب میرے بستر کے قریب آنے کی زحمت نہ دینا اس لئے کہ اگر میں گنہ گار ہوں تو اس کے منتر

میرے گناہوں کی تلافی نہیں کر سکتے۔ اور اگر میں بے گنہ ہوں۔ اُس کے "افوں" مجھے جلدی سے جنت میں نہیں پہنچا سکتے" انسان کی خواہش اللہ کے ارادوں کو نہیں بدل سکتیں، جس طرح نجومی ستاروں کی رفتار کو نہیں بدل سکتے۔۔ ...... ہاں میرے مرنے کے بعد حکیم اور پادری جو چاہیں کریں، موجیں شور وغل مچاتی رہتی ہیں اور جہاز ساحل سے لگ جاتا ہے"

جب وہ خوفناک رات آدھی ہوئی تو فارس کرامہ نے اپنی آنکھیں کھولیں جو نزع کی تاریکیوں میں غرق تھیں اور آخری مرتبہ اپنی غم زدہ بیٹی کو دیکھا۔ اُس نے کچھ کہنا چاہا لیکن نہ کہہ سکا اس لئے کہ موت اس پر غالب آ رہی تھی۔ بمشکل تمام یہ الفاظ اُس کی زبان سے ادا ہوئے:

"دیکھو! رات ختم ہوگئی ...... اور صبح نمودار ہو رہی ہے ...... سلمیٰ! .... سلمیٰ!! ....

اُس کا منہ ڈھلا، چہرہ پر زردی چھائی، ہونٹوں پر خفیف سا تبسم ظاہر ہوا اور روح پرواز کر گئی۔

سلمیٰ نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اپنے باپ کے ہاتھ کو مس کیا۔ مُردہ کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ پھر اُس نے اپنا سر اُٹھایا اور اُس کے چہرہ کی طرف دیکھا۔ بیمار کا چہرہ موت کی نقاب میں چھپ چکا تھا۔ سلمیٰ کے جسم میں زندگی جم کر رہ گئی اور آنسو اُس کی آنکھوں میں خشک ہو گئے۔ اُس نے حرکت کی، نہ چیخی چلائی بلکہ بُت کی طرح اپنے باپ کی لاش کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی، اُس کے اعضا بیجان

ہو گئے۔ جیسے گیلے کپڑے کا دامن۔ وہ نیچے کی طرف جھکنے لگی یہاں تک کہ اُس کی پیشانی زمین سے لگ گئی۔ آہستہ آہستہ اُس نے کہا:

"یا رب رحم کر!! اور تمام ٹوٹے ہوئے پروں کو قوت عطا فرما!!"

فارس کرامہ کا انتقال ہو گیا، اُس کا جسم مٹی میں مل گیا اور روح آغوشِ ابد میں آسودہ ہو گئی۔ اُس کے تمام مال و متاع پر منصور نے قبضہ جما لیا اور اُس کی بیٹی اپنی بدقسمتی کا شکار رہی۔ زندگی اُس کے لئے اس خوفناک ڈرامہ کی مثال تھی، جسے زمانہ کے مصائب نے مرتب کیا ہو۔

اور میں ـــــ میں اپنے توہمات اور وسوسوں کی نذر ہو رہا تھا۔ زمانہ نے مجھے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا، جس طرح گدھ اور عقاب، شکار کے گرد منڈلاتے ہیں۔ میں نے بہت چاہا کہ اپنے آپ کو کتابوں میں گم کردوں، شاید ان لوگوں کے واقعات سے میری طبیعت مانوس ہو جائے اور میں نے بہت کوشش کی کہ اپنے حال کو مذہبی کتابوں کے مطالعہ سے ماضی کی روح فزا عشرت گاہوں میں لوٹا دوں۔ لیکن بے سود! میں جہاں تھا وہیں رہا میری مثال اُس شخص کی سی تھی جو تیل کے چھینٹوں سے چراغ کو بجھانا چاہتا ہو اسلاف کے پُرشکوہ جشن و جلوس کے مناظر میں سے تاریک پرچھائیوں کے علاوہ مجھے کچھ نظر نہ آیا اور سابقہ قوموں کے زندگی بخش نغموں میں سے، میرے کانوں نے نوحہ و ماتم کے سوا کوئی آواز نہ سنی، میرے حالات نے مجھے اس قدر غم پسند بنا دیا تھا کہ حضرتِ ایوبؑ کے نوحے، میرے نزدیک حضرتِ داؤدؑ کی بانسری سے

زیادہ دلکش تھے، ارمیا کے مرثئے مجھے حضرت سلیمان کے نغموں سے زیادہ عزیز تھے، برامکہ کی تباہی و بربادی میری روح کے لئے عباسیوں کی عظمت و شوکت سے زیادہ وقیع تھی۔ ابن زریق کا قصیدہ میرے لئے خیام کی رباعیات سے زیادہ مؤثر تھا اور "ہملٹ" کا ڈرامہ تمام یوروپین تصانیف کے مقابلہ میں میرے دل سے زیادہ قریب تھا۔

اس طرح ناامیدی ہماری بصیرت کو کمزور کرتی ہے اور ہم دہشتناک سایوں کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھ سکتے اور اس طرح مایوسی ہمارے کانوں کو بہرا کردیتی ہے اور ہم بے چین دلوں کی دھڑکن کے سوا اور کچھ نہیں سُن سکتے۔

(۹)

عبادت گاہ

ان ٹیلوں اور مرغزاروں کے درمیان، جو بیروت کے اردگرد، لبنان کے دامن میں واقع ہیں، ایک چھوٹی سی قدیم عبادتگاہ ہے، جو ایک سفید چٹان کاٹ کر بنائی گئی ہے اور جس کے چاروں طرف زیتون، بادام اور بید کے درخت ہیں، اس کے باوجود کہ یہ عبادتگاہ، شام کی ان بہت سی گراں قدر چیزوں میں سے ہے، جو گمنامی کے پردہ میں چھپی ہوئی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گمنامی نے اس عبادت گاہ کو ماہرینِ آثار قدیمہ کی نگاہوں سے اس لئے پوشیدہ رکھا کہ وہ تھکی ہاری روحوں کے لئے خلوت کدہ اور وحشت زدہ عاشقوں کے لئے زیارت گاہ کا کام دے۔

اس عجیب و غریب عبادتگاہ میں داخل ہونے والا مشرقی دیوار پر ایک حقیقی طرز کی تصویر دیکھتا ہے جو چٹان کھود کر بنائی گئی ہے۔ اس تصویر کے کچھ نقوش، انقلاب زمانہ کے ہاتھوں محو ہو گئے ہیں، اور اس کے رنگ ماندو علام

کو موسموں کے تغیر نے رنگین کر دیا ہے۔ اس تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ حسن و محبت کی دیوی عشتروت ایک شاندار تخت پر بیٹھی ہے، اور اس کے چاروں طرف سات نوخیز لڑکیاں دو مختلف طریقوں سے کھڑی ہیں۔ پہلی لڑکی کے ہاتھ میں ایک مشعل ہے۔ اور دوسری کے ہاتھ میں رباب! تیسری لڑکی کے ہاتھ میں عود دان ہے اور چوتھی کے ہاتھ میں سبوئے شراب، پانچویں لڑکی کے ہاتھ میں گلاب کی ٹہنی ہے اور چھٹی کے ہاتھ میں شاداب پھولوں کا ہار اور ساتویں لڑکی جوان سب سے زیادہ البیلی اور چنچل معلوم ہوتی ہے، کمان میں تیر چڑھا رہی ہے۔ یہ سب کی سب عشتروت کی طرف دیکھ رہی ہیں اور ان سب کے چہروں پر انکسار و اطاعت کے آثار ہیں۔

دوسری دیوار پر ایک اور تصویر ہے، جو پہلی تصویر کے مقابلہ میں نئی اور بہت واضح ہے۔ اس تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ کو صلیب پر چڑھایا جا رہا ہے اور ان کے پہلو میں ان کی غمگین ماں حضرت مریم اور دو اور عورتیں ہیں، جو نالہ و شیون کر رہی ہیں۔ یہ تصویر بیزنطی اسلوب پر بنائی گئی ہے۔ قرینہ یہ بتاتا ہے کہ یہ تصویر پانچویں یا چھٹی صدی عیسوی میں کندہ کی گئی ہے[1]

[1] ماہرین آثار قدیمہ جانتے ہیں کہ مشرق کے اکثر مسیحی گرجا پہلے فینیقیوں اور قدیم یونانیوں کے بتخانے تھے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ فینیقی اور یونانی صنم کدے پہلے مسیحی عبادتگاہیں بنیں اور اس کے بعد اسلامی۔ چنانچہ دمشق انطاکیہ اور آستانہ میں بہت سی عمارتیں ہیں جنکے گوشوں میں پہلے بت پرستوں کے نغمات عبودیت گونجے، اس کے بعد ان کی چھتیں عیسائیوں کے عود لوبان سے معطر ہوئیں اور سب سے آخر میں مسلمانوں کی نمازیں ان کے در و دیوار میں جذب ہوئیں

مغربی دیوار میں دو گول روشندان ہیں، جن میں سے صبح کے وقت، سورج کی شعاعیں اندر داخل ہوتی ہیں، اور ان دونوں تصویروں پر پڑتی ہیں۔ سورج کی روشنی میں یہ تصویریں ایسی معلوم ہوتی ہیں، جیسے ان پر سونے کا پانی چڑھا دیا ہو۔

عبادتگاہ کے وسط میں سنگِ مرمر کا ایک گول پتھر ہے، اس پتھر کے چاروں طرف پرانی وضع کے نقش و نگار بنے ہیں، جن میں سے بعض نقوش، جمے ہوئے خون کے دھبوں میں چھپ گئے ہیں، خون کے یہ دھبے ظاہر کرتے ہیں کہ قدیم لوگ اس پتھر پر قربانیاں چڑھاتے، شراب و روغن کے مٹکے انڈیلتے اور عطر پاشی کرتے تھے۔

اس چھوٹی سی عبادتگاہ میں، اس گہری خاموشی کے علاوہ جو روحوں سے بغلگیر ہوتی ہے اور اس سحر آگیں جلال کے سوا، جو اپنی ہیجان آفرینیوں سے اسرارِ خداوندی کا انکشاف کرتا اور زبان بے زبانی میں بیتی ہوئی صدیوں کی داستان اور قوموں کے ایک حال سے دوسرے حال اور ایک مذہب سے دوسرے مذہب کی طرف سفرِ ارتقا کی کہانی سناتا ہے، اور کچھ نہ تھا، اسی سحر آگیں جلال کی کرشمہ سازیاں ہیں، جو شاعر کو اس عالم سے دور ایک اور عالم میں پہنچا دیتی اور فلسفی کو اس نقطہ پر مطمئن کر دیتی ہیں کہ انسان ایک مذہبی مخلوق ہے، جو ان دیکھی چیزوں کا احساس اور ان ہوئی باتوں کا تصور کرتا ہے۔ وہ اپنے شعور کے لئے اشاراتی تصویریں بناتا ہے، جو اپنے معنی کے اعتبار سے اس کے باطنی اسرار پر دلالت کرتی ہیں۔ اور اپنے خیالات کو اس کلام، ان نغموں، ان تصویروں، اور

اُن تمثیلوں کے ذریعہ مجسّم کرتا ہے، جو صوری اعتبار سے زندگی میں اس کی سب سے بڑی تمنا اور موت کے بعد اُس کی سب سے زیادہ حسین خواہش کو ظاہر کرتی ہیں۔

اس نامعلوم عبادت گاہ میں، میں سلمیٰ سے مہینہ میں ایک مرتبہ ملاقات کرتا تھا، ہمارا زیادہ وقت انہی دو انوکھی تصویروں کے دیکھنے میں صرف ہوتا تھا، ہم کبھی حضرتِ مسیح کے سولی چڑھائے جانے کے متعلق غور و فکر کرتے اور کبھی اپنے حافظہ میں ان فنیقی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی یاد تازہ کرتے، جنھوں نے اپنی زندگی، عشق و عاشقی اور حسن و جمال کی پرستش میں صرف کر دی جو عشترُوت کی مورتیوں کے سامنے عود و لوبان سلگاتے اور قربان گاہوں پر عطر پاشی کرتے تھے۔ یہاں تک کہ زمین نے اُنہیں اپنے میں جذب کر لیا اور دنیا میں ان کا صرف نام ہی نام رہ گیا۔

میرے لئے کس قدر دشوار ہے کہ میں اُن لطیف ساعتوں کی یاد حیطۂ تحریر میں لاؤں، جو میں نے سلمیٰ کے ساتھ اُس عبادت گاہ میں گذاری ہیں ——— وہ مقدس ساعتیں، جو لذت و الم، عشرت و غم، اُمید و یاس اور ہر اُس شے کو محیط تھیں جو انسان کو انسان اور زندگی کو ایک ابدی چیستاں بنا دیتی ہے۔ آہ! میرے لئے کتنا مشکل ہے کہ میں ان ساعتوں کو یاد کروں جبکہ اُن کا کوئی ایک تصوراتی جز بھی گفتگو کے ذریعہ، بیان نہیں کیا جا سکتا جو محبت اور غم کے پرستاروں کے لئے مثال کا کام دے سکے!

ہم دونوں اُس قدیم عبادتگاہ کی تنہائیوں میں ملاقات کرتے، اس کے

دروازہ پر دیوار کے سہارے بیٹھ کر ماضی کی دلچسپیوں کو یاد کرتے، موجودہ حالات کا تجزیہ کرتے اور مستقبل کی خوفناکیوں اور الم انگیزیوں کے تصور سے لرزہ براندام ہوتے۔

رفتہ رفتہ سلسلۂ کلام جب روحانی کیفیات کے اظہار پر پہنچا تو ہم میں سے ہر ایک اپنے دل کے اضطراب و سوزش اور اپنی مایوسیوں اور محرومیوں کی شکایت کرتا، اس کے بعد ہر ایک اپنی اپنی اُمیدوں کے خوش آئند تصورات اور پُر لطف اوہام دوسرے کے سامنے صراحۃً بیان کر کے اُسے صبر کی تلقین کرتا، یہاں تک کہ مصیبت کا احساس جاتا رہتا، آنسو خشک ہو جاتے، چہروں پر مسرت کی لہر دوڑ جاتی اور ہم مسکرانے لگتے، محبت اور اس کی عشرت زائیوں کے سوا، ہر چیز ہمارے ذہن سے محو ہو جاتی، اور روح اور اس کے میلانات کے سوا، ہم دنیا کی ہر شے سے قطع نظر کر لیتے، خود رفتہ ہو کر ہم ایک دوسرے سے گلے ملتے اور عشق و فریفتگی کا بے پناہ جذبہ ہم پر رقت طاری کر دیتا۔ اس کے بعد سلمیٰ شوق اور پاکیزگی کے زیرِ اثر، میری پیشانی چوم کر میرے دل کو محبت کی روشنی سے منور کر دیتی۔ جواباً میں بھی اُس کی سفید اُنگلیوں کو بوسہ دیتا، جس کے اثر سے اُس کی آنکھیں بند ہو جاتیں، ہاتھی دانت کی طرح حسین و نازک گردن جھک جاتی اور رخساروں پر ایک لطیف سُرخی نمودار ہو جاتی، جیسے سورج کی اوّلیں شعاعیں پہاڑوں کی چوٹی پر، عروسِ سحر سے ملاقات کریں، انجام کار ہم بالکل ساکت ہو جاتے اور دور شفق کی طرف دیکھنے لگتے جہاں مغرب کی سُرخ روشنی سے رنگین

بادل تیرتے ہوئے!!

ہماری یہ ملاقات محض شکوہ و شکایت اور مبادلۂ جذبات تک محدود نہ تھی، بلکہ ہم غیر محسوس طریقہ پر عام مسائل پر گفتگو کرنے لگتے۔ اس نرالی دُنیا کے حالات و کوائف ہمارے درمیان زیرِ بحث آتے اور ہم اُن کتابوں کے محاسن و معائب پر روشنی ڈالتے، جو ہمارے مطالعہ میں آئیں، یہی نہیں بلکہ ان کتابوں کی خیالی تصویروں اور اجتماعی اُصولوں پر رائے زنی کرتے، سلمیٰ اکثر اوقات، عورت کے سماجی مرتبے اُس کے اخلاق و رجحانات پر گزشتہ زمانہ کے اثرات اور موجودہ زمانہ کے ازدواجی تعلقات اور اُن کی کمزوریوں اور برائیوں پر گفتگو کرتی، مجھے یاد ہے ایک دفعہ اُس نے کہا تھا:

"شاعر اور ادیب چاہتے ہیں کہ عورت کی حقیقت معلوم کریں، لیکن وہ ہنوز اس کے دل کے رازوں اور سینہ کے بھیدوں کو نہ پا سکے، جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اُسے اپنی خواہشوں کے معیار پر جانچتے ہیں، اور اُنہیں اُس کی جسمانی حیثیت کے سوا، کچھ نظر نہیں آتا، پھر اُسے نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، جس کی وجہ سے اطاعت اور کمزوری کے سوا، اس میں اور کچھ نہیں پاتے"

عبادت گاہ کی دیواروں پر بنی ہوئی تصویروں کی طرف، اپنے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے ایک اور مرتبہ اُس نے مجھ سے کہا تھا:

"یہ نقوش، جو زمانہ نے اس چٹان پر مرتسم کئے ہیں عورت کے جذبات کا خلاصہ اور اُس نسوانی روح کی نزاکتوں اور باریکیوں کے آئینہ دار ہیں"

جو محبت اور غم کے درمیان ـــــ شوق اور قربانی کے درمیان ـــــ تخت پر متمکن عشتروت اور صلیب کے سامنے کھڑی ہوئی مریم کے درمیان ـــــ حرکت کرتی ہے!

آہ! کتنی عجیب اور کس قدر تلخ ہے یہ حقیقت، کہ عظمت و بزرگی اور شہرت و ناموری تو مرد حاصل کریں اور اس کی قیمت عورت کو ادا کرنی پڑے!!"

ہماری اس پوشیدہ ملاقات کا علم، اللہ اور ان پرندوں کے غول کے سوا، جو اس عبادت گاہ کی فضا میں اڑتے رہتے تھے، اور کسی کو نہ تھا۔ سلمیٰ، بادشاہ باغ تک اپنی گاڑی میں آتی اور وہاں سے پاؤں پیدل سنسان راستوں کو طے کرتی ہوئی مقررہ مقام تک پہنچتی۔ وہ جب اپنی چھتری کے سہارے، سکون و اطمینان کے ساتھ، اس عبادتگاہ کے دروازہ میں داخل ہوتی، تو مجھے اپنی آمد کا منتظر و مشتاق پاتی،

ہمیں رقیب کی نگاہوں کا خوف تھا، نہ ضمیر کی ملامتوں کا احساس۔ اس لئے کہ وہ روح جس نے آنسوؤں سے غسل کر کے، مقدس آگ کے سامنے سجدۂ عبودیت ادا کر لیا ہو، انسان کے مفروضہ ننگ و عار سے ارفع و اعلیٰ ہو جاتی ہیں اور ان ضابطوں کی غلامی سے نجات حاصل کر کے جو کورانہ تقلید نے قلب انسانی اور اس کے جذبات و میلانات کے لئے وضع کئے ہیں دربار خداوندی میں عزت و سربلندی کے ساتھ کھڑی ہوتی ہیں۔

سماج سات ہزار برس سے، ناقص و ناکارہ قانون کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، اس لئے وہ مقدس اور ازلی و ابدی ناموسِ فطرت کی حقیقت

سمجھنے سے قاصر ہے۔ انسان کی بصارت ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کی عادی ہے اس لئے وہ آفتاب کی روشنی کی تاب نہیں لا سکتی مندوح کی مختلف بیماریاں۔ زمانہ نے وراثتہً ایک فرد سے دوسرے فرد میں منتقل کی ہیں، یہاں تک کہ وہ عام، بلکہ صفات انسانی کا جزو و لازم ہو گئی ہیں، اس لئے انسان اُسے بیماریاں نہیں؛ اپنی فطری خصوصیات سمجھتا ہے اور اگر کوئی شخص اُن فطری خصوصیات سے عاری نظر آتا ہے تو گمان کرتا ہے کہ وہ ناقص اور روحانی کمالات سے محروم ہے!

اس لئے وہ لوگ، جو اس بات پر کہ سلمیٰ اپنے شوہر سے چھپ کر، ایک غیر آدمی سے تنہائی میں ملتی تھی، اُسے عیب لگائیں یا بدنام کریں، وہ اُن بیمار اور کمزور لوگوں میں سے ہیں جو بے گناہوں کو مجرم سمجھتے ہیں اور قابل احترام شخصیتوں کو باغی بلکہ اُن کا شمار حشرات الارض میں ہے، جو تاریکی میں نکلتے ہیں اور دن کی روشنی میں نکلتے ہوئے اس لیئے ڈرتے ہیں کہ کہیں آنے جانے والوں کے قدم اُن کو پامال نہ کر دیں۔

وہ مظلوم قیدی، جو قید خانہ کی دیواریں ڈھا سکتا ہو اور نہ ڈھائے، "واقعہ" بزدل ہے، لیکن سلمیٰ تو اُن مظلوم قیدیوں میں سے تھی جو اپنی کوششوں سے آزاد نہیں ہو سکتے پھر اُسے قید خانہ کے روزن دیوار سے سرسبز کھیتوں اور وسیع فضا کو دیکھنے پر کیسے ملامت کی جا سکتی ہے؟ کیا لوگ محض اس لئے اُسے خائن کا سمجھیں گے کہ وہ اپنے شوہر کے گھر سے نکل کر، مقدس عشترت اور پُر عظمت مسیح کے درمیان، میرے پہلو میں بیٹھتی تھی؟

دنیا، جو چاہے، کہے! سلمیٰ ان تمام چیزوں سے گزر کر، جہاں روحیں

چمٹی رینگ رہی ہیں، اس عالم میں پہنچ گئی تھی، جہاں بھیڑیوں کی چیخ پکار اور اژدہوں کی پھنکار کی آوازیں نہیں پہنچتیں۔

رہ گیا میں تو مجھے بھی دنیا کے کہنے سننے کی پرواہ نہیں، اس لئے کہ موت سے دوچار ہونے والا، رہزنوں اور ڈاکوؤں سے خائف نہیں ہوتا۔ اور وہ سپاہی جس کے سر پر تلواریں سایہ فگن اور پاؤں تلے خون کی ندیاں رواں ہوں، بازاری لڑکوں کی سنگ باریوں کی فکر نہیں کرتا۔

(۱۰)

قُربانی

جون کی آخری تاریخیں تھیں، ساحلی علاقوں پر نہایت شدید گرمی پڑ رہی تھی لوگ پہاڑوں پر جاچکے تھے میں اپنے معمول کے مطابق. دل میں سلمیٰ کی ملاقات کا ارمان لیے عبادت گاہ کی طرف گیا، میرے ہاتھ میں اُندلسی نظموں کا ایک مختصر سا مجموعہ تھا، جو آج بھی میری روح کو اسی طرح گرماتی ہیں، جیسے اُس زمانہ میں گرماتی تھیں۔

میں عبادت گاہ میں شام کے وقت پہنچا اور بید ولیموں سے چھپی ہوئی سڑک کے ایک کنارے بیٹھ کر اُن نظموں کے اشعار گنگنانے لگا، جو اپنی بندشوں کی چستی اور اوزان کے ترنم سے دل کو لبھاتی ہیں۔ میرا ذہن اُن بڑے بڑے بادشاہوں، شاعروں اور شہ سواروں کی یاد تازہ کر رہا تھا، جو غرناطہ، قرطبہ اور اشبیلیہ سے اپنی تمام روحانی آرزوؤں اور تمناؤں کو محلوں، باغوں اور دوسری تفریح گاہوں میں چھوڑ کر رخصت ہوگئے اور اپنی

آنکھوں آنسوؤں کا طوفان اور دلوں میں حسرتوں کی دنیا لئے زمانہ کے پردوں میں چھپ گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو سلمیٰ سایہ دار درختوں میں سے آتی نظر آئی، وہ چھتری کے سہارے میری طرف آرہی تھی، گویا ساری دنیا کے افکار و مصائب کا بار اس پر ہے، جب وہ عبادت گاہ کے دروازہ پر پہنچ کر میرے قریب بیٹھ گئی۔ تو میں نے اس کی بڑی بڑی آنکھوں کی طرف نگاہ کی، میں نے دیکھا کہ اس کی نگاہوں میں کچھ عجیب اور نئے اسرار و معانی ہیں جن میں تنبیہ و اجتناب کا پیغام بھی ہے اور تجسس و تفحص کی دعوت بھی!

سلمیٰ میری کیفیات قلب کو تاڑ گئی اُسے گوارا نہ ہوا کہ میرے شکوک اور وسوسوں کے درمیان جو کشمکش برپا ہے، وہ طول کھینچے، اُس نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا:

"میرے قریب آؤ، میرے حبیب! میرے قریب آؤ!! آہ! وہ گھڑی اب سر پر آپہنچی ہے، جو ہمیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا کر دیگی!!"

بیتاب ہو کر میں نے پوچھا:

"سلمیٰ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تمہارا کیا مطلب ہے؟ وہ کونسی قوت ہے جو ہمیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا کرے؟"

اس نے جواب دیا:

وہ اندھی قوت، جس نے کل ہمیں ایک دوسرے سے جدا کیا تھا، وہی آج بھی ہمیں ایک دوسرے سے جدا کرے گی۔ اُس گونگی قوت نے جس

کے ترجمان، انسانی قوانین ہیں۔ ایک بندۂ زندگی کے ہاتھوں میرے اور تمہارے درمیان ایک دیوار حائل کر دی ہے، اُس قوت نے، جو شیطانوں کو پیدا کرتی اور اُنہیں انسانی روحوں کا محافظ بناتی ہے، مجھ پر پابندی لگائی ہے کہ میں اُس مکان سے باہر نہ نکلوں، جو ہڈیوں اور مُردہ کھوپڑیوں سے تعمیر کیا گیا ہے۔"

میں نے سوال کیا:

"کیا تمہارے شوہر کو ہماری ملاقات کا علم ہو گیا ہے؟ کیا تم اُس کے غضب اور انتقام سے ڈر رہی ہو؟"

جواباً اُس نے کہا:

"میرا شوہر میری بالکل پرواہ نہیں کرتا، اُسے کچھ معلوم نہیں کہ میں کس طرح زندگی گذار رہی ہوں۔ وہ مجھ سے غافل ہے اور اپنا وقت اُن مصیبت زدہ لڑکیوں میں گذارتا ہے جن کی غربت و محتاجی نے اُنہیں عصمت فروشوں کے بازار میں پہنچا دیا ہے۔ اور جو، خون اور آنسوؤں سے گندھی ہوئی روٹی کے عوض اپنے بنے سنورے جسم کو بیچتی ہیں۔"

میں نے کہا۔

پھر تمہیں اس عبادتگاہ میں آنے اور جلالِ خداوندی کے سامنے میرے پہلو میں بیٹھنے سے کون روکتا ہے؟ کیا تمہاری نگاہ، میرے روحانی اسرار کے مشاہدہ سے اُکتا گئی ہے، جو تمہاری روح بھی رخصت وجدائی کی طالب ہے؟"

آبدیدہ ہو کر اُس نے جواب دیا۔

"نہیں میرے پیارے! میری روح تم سے جدا ہونا نہیں چاہتی، اسلئے کہ تم اس کا جزو لاینفک ہو، نہ میری آنکھیں تمہارے دیدار سے اکتاتی ہیں۔ اس لئے کہ تم اُن کی روشنی ہو لیکن مشیت الٰہی اگر یہ ہو کہ میں تو زنجیر و سلاسل میں جکڑی ہوئی زندگی کے رستوں پر چلوں تو میں کیسے گوارا کر سکتی ہوں کہ اس روح فرسا عالم میں تم بھی میرے شریک حال ہو!"

میں نے کہا! میں یہ پہیلیاں نہیں بوجھ سکتا! خدا کے لیے تمہیں جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہدو!!"

سلمیٰ نے جواب دیا۔

"میرے لئے نا ممکن ہے، کہ میں تمہیں ساری باتیں صاف صاف بتاؤں اس لئے کہ وہ زبان، جسے درد و غم نے گونگا کر دیا ہو، نہیں کھل سکتی، اور وہ ہونٹ، جن پر ناامیدی نے مہر لگا دی ہو، نہیں ہل سکتے، میں تم سے صرف اسی قدر کہہ سکتی ہوں کہ مجھے خوف ہے، کہیں تم اس جال میں نہ پھنس جاؤ جو لوگوں نے مجھے شکار کرنے کے لئے پھیلائے ہیں۔"

میں نے پوچھا،

"سلمیٰ! تمہارا مطلب کیا ہے؟ وہ لوگ کون ہیں، جن کے متعلق تمہیں خوف ہے کہ وہ مجھے کوئی آزار نہ پہنچائیں؟"

اس نے حسین چہرہ اپنے ہاتھوں سے چھپا لیا اور شوق و محبت سے بھری ہوئی ایک آہ کھینچ کر کہنے لگی:

"پادری کو معلوم ہو گیا ہے کہ میں مہینہ میں ایک دن اس قبر سے نکلتی

ہوں جہاں اُس نے مجھے دفن کر رکھا ہے۔"

میں نے پوچھا:

"کیا اُسے یہ علم ہو گیا ہے کہ تم مجھ سے اس جگہ ملاقات کرتی ہو؟"

اُس نے جواب دیا۔

"اگر اُسے یہ معلوم ہو جاتا تو مجھے اس وقت تم اپنے پہلو میں نہ دیکھتے۔ لیکن اُسے میرے متعلق شک ہو گیا ہے اور بدگمانیاں اُس کے دل میں راہ پا گئی ہیں، اُس نے کچھ لوگ میرے لئے مقرر کر دیئے ہیں اور اپنے ملازموں کو حکم دیدیا ہے کہ میری حرکات کی نگرانی کریں یہاں تک کہ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ اس مکان میں جہاں وہ رہتا ہے، اور اُن راستوں میں جہاں میں چلتی پھرتی ہوں، نگاہیں ہیں، جو مجھے غور سے دیکھتی ہیں، ہاتھ ہیں، جو میری طرف اشارے کرتے ہیں، اور کان ہیں جو میرے افکار کی سرگوشیاں سنتے ہیں۔"

سلمیٰ خاموش ہو گئی، آنسو اس کے رخساروں پر بہ رہے تھے، تھوڑی دیر کے بعد اُس نے کہا:

"مجھے اپنے متعلق پادری کی ذات سے کوئی خوف نہیں ہے، اس لئے کہ ڈوبنے والا موجوں کے تھپیڑوں سے نہیں ڈرتا، لیکن مجھے خوف ہے کہ تم جو آفتاب کی روشنی کی طرح آزاد ہو، کہیں میری طرح اُس کے جال میں نہ پھنس جاؤ اور وہ تمہیں اپنے پنجوں میں دبوچ کر کہیں پھاڑ نہ کھائے، مجھے زمانہ کا بھی کوئی خوف نہیں ہے اس لئے کہ اس نے سارے تیر میرے سینہ میں

پیوست کر دئیے ہیں، لیکن مجھے ڈر ہے کہ عمر کے اس بہترین دور میں کہیں سانپ تمہارے پاؤں کو نہ چَنک لیں اور کہیں تم پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے سے نہ رہ جاؤ، جہاں مستقبل اپنی مسرتوں اور بزرگیوں سمیت تمہارا انتظار کر رہا ہے!"

میں نے کہا۔

"جسے زمانہ کے سانپ نہیں ڈستے اور جو دنیا کے بھیڑیوں کا شکار نہیں ہوتا، وہ ہمیشہ بھٹکتا رہتا ہے! لیکن سلمیٰ! سنو، اور غور سے سنو!! کیا جدائی کے سوا ہمارے لئے اور کوئی راہ نہیں ہے، جو ہمیں لوگوں کی دنائت، ذلیلی اور ان کے شر و فساد سے محفوظ رکھ سکے؟ کیا ہمارے لئے محبت، زندگی اور آزادی کے سارے راستے بند ہو گئے ہیں کہ ہمیں بندگانِ موت کی مرضی کے سامنے سر جھکانے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار ہی نظر نہیں آتا۔؟"

حسرت و نا امیدی کے لہجہ میں اس نے جواب دیا:

"آہ! جدائی کے سوا، اب کوئی چارہ نہیں!!"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ میرے ذہن میں باغیانہ خیالات بیدار ہو گئے تھے اور میری نوجوانی کے شعلہ سے دھواں اُٹھنے لگا تھا۔ پُرجوش لہجہ میں میں نے کہا:

"سلمیٰ! ہمارا سر بہت دن سے دُنیا کی غلط خواہشوں کے سامنے جھکا ہوا ہے، اُس وقت سے لیکر، جب ہم ایک دوسرے سے آشنا ہوئے تھے۔ آج تک ہم اُس کی جکڑ بندیوں کو برداشت کر رہے ہیں، ہم مدتوں سے اندھوں کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں اور ان کے بنائے ہوئے بتوں کی پوجا کر رہے ہیں، ہم پادری کے ہاتھ کی دو گیند ہیں، جن سے وہ جس طرح چاہتا ہے کھیلتا ہے اور جہاں چاہتا ہے پھینک دیتا ہے، تو کیا پھر بھی ہم اس کے سامنے سرِ اطاعت خم رکھیں؟ کیا ہم اس کی من کی تاریکی کو غور سے دیکھیں، ہم

یہاں تک کہ وہ ہمیں قبر میں سلا دے اور ہم زمین کی غذا بن جائیں؟ کیا اللہ نے ہمیں زندگی اسی لیے عطا کی ہے کہ ہم اُسے موت کے قدموں میں ڈال دیں؟ کیا اُس نے ہمیں آزادی اسی لئے دی ہے کہ ہم اُسے غلامی و بندگی کے لئے سایہ بنا لیں؟ سلمیٰ اپنے ہاتھوں اپنے من کی آگ بجھانا، دوسرے لفظوں میں اس قوت سے انکار کرنا ہے جس نے وہ آگ ہمارے من میں روشن کی ہے اور جور و حق تلفی پر صبر کر کے ظلم کے خلاف بغاوت نہ کرنا، گویا حق کے خلاف، باطل کا ساتھ دینا ہے اور بے گناہوں کے قتل کرنے میں ظالموں کی اعانت کرنا ہے۔ سلمیٰ! میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم مجھ سے محبت کرتی ہو اور محبت ایک بے بہا خزانہ ہے جو اللہ کی طرف سے حساس اور بزرگ روحوں کو عطا کیا جاتا ہے تو کیا ہم اپنے اس خزانہ کو خنزیروں کے جرگہ میں پھینک دیں تاکہ وہ اسے اپنی تھوتھنیوں سے اُلٹ پلٹ کر کے قدموں میں روند ڈالیں۔ ہمارے سامنے حسین و اعجوبہ کار دنیا اور اُس کی وسیع کشادہ نزہت گاہیں ہیں، پھر کس لیے ہم اس تنگ و تاریک سُرنگ میں پڑے رہیں، جو پادری اور اُس کے ساتھیوں نے کھودی ہے؟ ہمارے سامنے زندگی اور اُس کی آزادیاں ہیں آزادی اور اُس کی شادمانیاں ہیں، پھر کیوں نہ ہم اپنی گردن سے اس بھاری جوے کو اُتار پھینکیں اور کیوں نہ ہم اپنے پاؤں میں پڑی ہوئی بیڑیوں کو توڑ کر اُس مقام پر چلے جائیں، جہاں ہر طرف راحت ہی راحت ہے؟ سلمیٰ! اُٹھو، ہم اس چھوٹی سی عبادت گاہ سے خدائے بزرگ کی بڑی عبادت گاہ میں چلیں، آؤ ہم اِن شہروں اور اِن کی جہالت و غلامی کو چھوڑ کر

اُن دور دراز مقامات کی طرف کوچ کر جائیں، جہاں نہ ڈاکوؤں کی دراز دستی کا خوف ہے نہ شیطان کے مکر و فریب کا۔ آؤ! رات کی تاریکیوں میں چھپ کر، ساحل سمندر پر بھاگ چلیں اور کشتی میں سوار ہو کر پار پہنچ جائیں، وہاں ہم ایک نئی زندگی ——— محبت اور پاکیزگی کی زندگی ——— بسر کریں گے، جو اژدہوں کی پھنکاروں اور درندوں کی خونخواریوں سے بالکل محفوظ ہوگی۔ سلمیٰ یہ سوچنے کا موقع نہیں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لمحے، جو بادشاہوں کے تاج سے زیادہ قیمتی اور فرشتوں کی لطافتِ فکر سے زیادہ لطیف ہیں، ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں۔ اُٹھو! محبت کی روشنی میں ہم اس بے آب و گیاہ صحرا سے نکل کر سر سبز و شاداب باغوں میں چلیں!!"

سلمیٰ نے سر اُٹھایا اور عبادت گاہ کی فضا میں کسی غیر مرئی شئے پر اپنی نگاہیں جما دیں۔ اس کے ہونٹوں پر غمگین تبسم نمودار ہوا، جو اس کے روحانی رنج و الم کا آئینہ دار تھا۔ پُر اطمینان لہجے میں اُس نے کہا:

"نہیں میرے پیارے! یہ کبھی نہیں ہو سکتا!! اللہ نے مجھے زہر کا پیالہ عطا کیا تھا، جسے میں نے گھونٹ گھونٹ کر کے پیا۔ اس پیالے میں اب صرف چند قطرے باقی ہیں اور میں چاہتی ہوں کہ اُنھیں بھی نہایت صبر اور استقلال کے ساتھ حلق سے اُتار لوں تاکہ مجھ پر وہ اسرار منکشف ہو جائیں، جو اس پیالہ کی تہ میں پوشیدہ ہیں۔ میں اُس نئی اور مقدس زندگی کی اہل نہیں ہوں، جو راحت، اطمینان، محبت کا گہوارہ ہو اور نہ مجھ میں اتنی سکت ہے کہ اس کی لذتوں اور مسرتوں کو برداشت

کر سکوں۔ ایک پر شکستہ پرندہ زمین پر رینگ سکتا ہے، فضا میں پرواز نہیں کر سکتا۔ چندھیائی ہوئی آنکھیں بے نور چیزوں پر جم سکتی ہیں، آفتاب کی روشنی کی تاب نہیں لا سکتیں! خدارا تم میرے سامنے سعادت و کامرانی کی باتیں نہ کرو! ان سے مجھے تکلیف پہنچتی ہے، بالکل اسی طرح، جیسے ناکامی و نامرادی کی داستان وجہ الم ہوتی ہے، میرے سامنے عیش و مسرت کی تصویریں نہ کھینچو! مجھے ان سے ڈر لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح، جیسے رنج و مصیبت کا تصور، خوف و دہشت پیدا کرتا ہے۔ میں تو اسی میں خوش ہوں کہ تمہاری محبت کے اس مقدس شعلہ کو ہوا دیتے جاؤں جسے اللہ نے میری خاکستر دل میں روشن کیا ہے۔

تم جانتے ہو کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں جس طرح ماں اپنے اکلوتے بچے سے محبت کرتی ہے، یہی محبت ہے جس نے مجھے بتایا کہ میں تادم واپسیں تمہاری حفاظت کروں۔ ہاں یہی پاک محبت ہے جو مجھے اس وقت تمہارے ساتھ بھاگ جانے سے روک رہی ہے، مجبور کر رہی ہے کہ میں اپنے ہاتھوں اپنی تمام خواہشوں اور تمناؤں کا گلا گھونٹ دوں، محض اس لئے کہ تم دنیا کی لعنت و ملامت سے محفوظ رہ کر عزت و آزادی کی زندگی بسر کرو۔

وہ محبت محدود ہے، جو محبوب پر قابو حاصل کرنا چاہتی ہے، لیکن وہ محبت جو زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے، محبوب کی ذات کے سوا اور کچھ نہیں چاہتی۔

وہ محبت جو، جوانی کی غفلت و ہوشیاری کے درمیان پیدا ہوتی ہے محبوب کے دیدار و وصال سے مطمئن ہو جاتی اور بوسوں کی حلاوت اور ہم آغوشیوں کی

لذت سے معمور باقی ہے لیکن وہ محبت جو آغوشِ الٰہی میں پروان چڑھتی ہے۔ دوام و ہمیشگی کے بعد بغیر مطمئن ہوتی ہے، نہ خدا کے سوا کسی اور قوت سے ڈرتی ہے۔

کل جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ پادری نہایت سختی کے ساتھ میری نگرانی کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ مختلف قسم کی پابندیاں لگا کر، مجھے اس تنہا مسرت سے بھی محروم کر دے جو شادی کے بعد، میرے لئے باقی رہ گئی ہے، تو میں اپنے کمرہ کی کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی اور سمندر کا نظارہ کرنے لگی۔ اس وقت میرا ذہن تمدن و تہذیب کی کارفرمائیوں اور نقلی و معنوی آزادی پر غور کر رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرا من تمہارے پہلو میں ہے جسے تمہارے روحانی تصورات نے گھیر رکھا ہے اور جو تمہاری محبت میں غرق ہے لیکن میرا دماغ ان شیریں خیالات سے فارغ تھا جو مظلوم عورتوں کے سینہ کو روشن کر دیتے ہیں اور حق و آزادی کے سایہ میں زندگی بسر کرنے کے لئے انہیں بے معنی رواجی پابندیوں کے خلاف بغاوت کا سبق پڑھاتے ہیں یہاں تک کہ مجھے اپنے من سے نفرت ہو گئی اور میں اُسے بے حقیقت سمجھنے لگی، مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ہماری محبت ناقص اور محدود ہے جو زمانہ کے مقابلہ سے عاجز ہے۔ میں رونے لگی، اس بادشاہ کی طرح جس کی حکومت چھین لی گئی ہو، اور اُس دولت مند کی طرح، جس کے خزانے لوٹ لئے گئے ہوں۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد، مجھے اپنے آنسوؤں میں تمہارا چہرہ نظر آیا، میں نے دیکھا کہ تم مجھے غور سے دیکھ رہے ہو۔ مجھے یاد آگیا،

ایک مرتبہ تم نے مجھ سے کہا تھا: "او سلمیٰ! ہم دشمنوں کے مقابلہ پر ڈٹے جائیں اور اُن کے وار اپنے سینہ پر لیں۔ اگر اس معرکہ میں ہمیں شکست ہوئی تو ہم شہیدوں کی موت مریں گے اور اگر غلبہ حاصل ہو گیا تو ہماری زندگی، غازیوں کی زندگی ہوگی۔ آلام و مصائب کا مقابلہ کرنے سے جو تکلیف روح کو پہنچتی ہے، وہ شکست خوردگی کے امن و اطمینان سے کہیں بہتر و افضل ہے" یہ الفاظ تمہاری زبان سے اس وقت ادا ہوئے تھے، جب موت کا فرشتہ، ابا جان کے بستر کے گرد، اپنے بازو پھڑپھڑا رہا تھا، اور مجھے کل اُس وقت یاد آئے، جب نا اُمیدی میرے سر پر منڈلا رہی تھی۔ تمہارے ان الفاظ سے میری ڈھارس بندھی میرا حوصلہ بڑھا، اور قید خانہ کی تاریکی میں، میں نے اپنے من کے اندر آزادی روح کی ایک ایسی کیفیت محسوس کی جو مصیبتوں اور تکلیفوں کا مذاق اڑاتی اور درد و الم کی تحقیر کرتی ہے، میں نے ایک کنواں دیکھا، جو سمندر سے زیادہ گہرا، ستاروں سے زیادہ بلند اور فضا سے زیادہ وسیع تھا۔

آج میں اپنی کمزور، غم زدہ روح میں ایک نئی قوت لیکر آئی ہوں اور وہ سب سے بڑے مقصد کے لئے ایک بڑی چیز کی قربانی ہے ——— تمہارے حضور، میری کامرانیوں کی قربانی! تاکہ تم دنیا میں عزت اور بلندی کے ساتھ زندگی بسر کرو اور لوگوں کی بے وفائیاں اور بد سلوکیاں تمہیں کوئی تکلیف نہ پہنچائیں۔

کل تک میں یہاں آتی تھی اور بھاری زنجیریں میرے کمزور پاؤں میں پڑی رہتی تھیں، لیکن آج میں ایک ایسے ارادہ کا احساس لیکر آئی ہوں

جو زنجیر کی گرانباریوں کی ہنسی اُڑاتا اور مصیبت کی راہوں کو اپنے لئے ناکافی سمجھتا ہے۔

پہلے میں جنگ کے سناٹے کی طرح لرزتی کانپتی آئی تھی لیکن آج اس باہمت عورت کی طرح بے کھٹکے آئی ہوں جو قربانی کی ضرورت و اہمیت کو سمجھتی ہے جو درد و الم کی قیمت جانتی ہے اور جو چاہتی ہے کہ اپنے محبوب کو بیوقوف لوگوں اور اپنے بھوکے نفس سے بچائے!

کل تک میں تمہارے سامنے لرزیدہ سائے کی طرح بیٹھی تھی لیکن آج میں مقدس عشتروت اور مسیح ناصری کے روبرو دم پر اپنی حقیقت واضح کرتی آئی ہوں، میں ایک درخت ہوں جو آڑ میں پھلا پھولا ہے، لیکن آج میری ٹہنیاں دن کی روشنی میں لہلہانے کے لئے پھیل گئی ہیں۔

میرے پیارے آج میں تمہیں رخصت کرنے آئی ہوں، اور چاہتی ہوں کہ یہ جدائی ہماری محبت کی طرح پُرعظمت اور حوادث پسند ہو جائے —

وہ آگ بن جائے، جو سونے کو تپا کر، کندن بنا دیتی ہے!

سلمیٰ نے میرے لئے مزید گفتگو اور دلیل و حجت کی گنجائش باقی نہ رکھی، بلکہ جب اُس نے مجھے دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی، جس نے میرے وجدان کو گھیر لیا اُس کے چہرہ پر وقار و جلال کی نقاب پڑ گئی اور وہ ایک دیوی معلوم ہونے لگی، جس کے حضور عجز و خاموشی کے سوا اور کسی کو بار نہیں ملتا، اس کے بعد وہ میرے سینہ پر گر پڑی، اپنی گوری گوری کلائیاں میری گردن میں حمائل کر دیں — اور میرے ہونٹوں کو بوسہ دیا

—— طویل عمیق اور گرم بوسہ، جس نے میرے جسم میں احساسِ زندگی کو بیدار، میری روح کے مخفی اسرار کو منکشف اور میری شخصیت کو، جسے ہم "میں" کہتے ہیں، دنیا و مافیہا کے خلاف آمادۂ بغاوت کر دیا تاکہ وہ احترام اور خاموشی کے ساتھ اُس ناموسِ الٰہی کے سامنے ہدیۂ عجز و نیاز پیش کرے، جس نے سلمیٰ کے سینہ کو ہیکل اور اُس کی روح کو قربان گاہ بنا دیا تھا۔

جب سورج غروب ہوا اور اُس کی آخری شعاعیں بھی عمارتوں اور باغوں سے رخصت ہو گئیں تو سلمیٰ میرے پاس سے ہٹ کر عبادت گاہ کے وسط میں جا کھڑی ہوئی اور اُس کی دیواروں اور گوشوں کو دیر تک دیکھتی رہی، گویا اُن اشاراتی تصویروں پر اپنی آنکھوں کی روشنی بکھیر دینا چاہتی ہے، اس کے بعد اُس نے کچھ قدم بڑھائے اور حضرتِ مسیح کی تصویر کے سامنے عجز و انکسار کے طور پر گر پڑی۔ اُس نے تصویر کے زخمی پاؤں کو مسلسل بوسے دئیے اور آہستہ آہستہ کہنے لگی:

"اے مسیح ناصری! میں نے عشرت اور اُس کی آغوشِ مسرت کو چھوڑ کر آپ کی سولی کو اپنے لئے پسند کر لیا ہے، میں پھولوں کے بدلے کانٹوں کا تاج اپنے سر پر رکھنے کے لئے تیار ہوں، میں عطر و خوشبو کی بجائے اپنے خون اور اپنے آنسوؤں میں نہا سکتی ہوں اور اس ساغر میں جو شراب کوثر کے لئے بنایا گیا ہے، زہر کے گھونٹ پینے پر آمادہ ہوں، اس لئے آپ مجھے اپنے ان حلقہ بگوشوں میں شامل کر لیں، جن کی کمزوریاں ہی اُن کی قوت ہیں اور مجھے اپنے ان پیاروں کے ساتھ بارگاہِ جلال میں پہنچا دیں جو اپنی محرومیوں پر مطمئن اور اپنے درد و غم سے مسرور ہیں۔"

اس کے بعد وہ کھڑی ہوئی اور میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی۔

"میں اس تاریک غار کی طرف خوشی خوشی واپس جا رہی ہوں، جہاں خوفناک سائے رینگ رہے ہیں۔ میرے محبوب، مجھ پر ترس نہ کھانا، نہ میرا ماتم کرنا اس لئے کہ وہ روح، جو ایک مرتبہ پرتوِ خداوندی سے چشم آشنا ہو گئی ہو شیطانوں کے سایہ سے نہیں ڈرتی، اور وہ آنکھ جس نے ایک لمحہ کے لئے بھی بارگاہ قدس کی خاک کا سرمہ لگا لیا ہو، دنیا کے درد و تکلیف سے بند نہیں ہوتی۔

سلمیٰ اپنے ریشمی لباس میں لپٹی ہوئی اس عبادت گاہ سے چلی گئی اور مجھے حیران و سرگرداں فکرمند اور ان خیالی سبزہ زاروں میں محو چھوڑ گئی جہاں دیوتا اپنے سنگھاسن پر براجمان ہوتے اور فرشتے انسان کا نامۂ اعمال مرتب کرتے ہیں جہاں روحیں زندگی کی کہانی پڑھتی ہیں اور خیال کی پریاں، محبت، غم اور بقائے دوام کے گیت گاتی ہیں۔

میں اس نشے سے چونکا، تو رات کی سیاہ لہریں، بحرِ ہستی میں موجزن تھیں میں نے دیکھا کہ میں کچھ کھویا کھویا سا ہوں۔ سلمیٰ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ میرے حافظہ میں ایک ایک کر کے گونج رہے ہیں اور میں اس کی حرکات و سکنات، اس کے خدوخال اور اس کے نازک ہاتھوں کے شیریں لمس کی یاد سے دل ہی دل میں لطف اٹھا رہا ہوں۔ یہاں تک کہ جب مجھ پر اپنی اور سلمیٰ کی اس جدائی اور جدائی کے بعد کی تنہائیوں کے غم اور شوق کی تلخیوں کی حقیقت واضح ہوئی تو میری قوتِ فکر جامد ہو کر رہ گئی اور میرے دل کی رگیں ڈھیلی پڑ گئیں مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ انسان ہر چند کہ وہ فطرتاً آزاد ہے، اپنے آباؤ اجداد کے بنائے ہوئے قانون کی سنگدلی کا ساری عمر شکار رہتا ہے، اور تقدیر

جسے ہم "سترِ الٰہی" سمجھتے ہیں، وہ "کل" کے ناگزیر نتائج کے مقابلہ میں "آج" کی سپر اندازی ہے اور "آج" کے میلانات و رجحانات کے حضور "کل" کی اطاعت و فرمانبرداری۔

اس رات سے لیکر اس وقت تک میں نے کئی مرتبہ ان نفسی قوانین پر غور و تامل کیا جن کی بنا پر سلمٰی نے زندگی کے بدلے موت کو اپنے لئے منتخب کیا اور کئی مرتبہ باغیوں کی سعادت و کامرانی کا قربانی کی عظمت و شرافت سے مقابلہ کیا، محض یہ دیکھنے کے لئے کہ ان دونوں میں کون زیادہ حسین کون زیادہ بزرگ ہے۔ لیکن اس وقت تک صرف ایک حقیقت میری سمجھ میں آئی ہے اور وہ یہ کہ عمل کے حسن و شرافت کا سرچشمہ اخلاص ہے اور سلمٰی اخلاص و خوش اعتقادی کا مجسمہ!

(۱۱)

خاتمہ

سلمٰی کی شادی کو پانچ برس ہو چکے تھے، لیکن اب تک اُس کے ہاں کوئی بچہ نہیں ہوا تھا جو اپنی ماں اور اپنے باپ کے درمیان روحانی تعلق اور اُن کی متنفر روحوں میں اپنی مسکراہٹوں سے قوت پیدا کر دیتا، جس طرح، صبح، رات کے آخری اور دن کے ابتدائی حصّہ کو ملا دیتی ہے۔

بانجھ عورت دنیا کے ہر گوشہ میں ذلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اس لئے کہ پندارِ ہستی اکثر مردوں کو یہ باور کرا دیتا ہے کہ اولاد ان کی زندگی کے دوام کا سبب ہوتی ہے اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ اپنی نسل کے ذریعہ زمین پر دائمی قبضہ رکھیں۔

ایک مادّہ پرست اپنی بانجھ بیوی کو اس قدر ناگواری کے ساتھ دیکھتا ہے گویا کوئی اس کے سامنے گھل گھل کر مر رہا ہے، وہ اس سے نفرت کرتا ہے، یہاں تک کہ اُسے چھوڑ دینا ہی نہیں بلکہ چاہتا ہے کہ وہ جلد سے جلد مر جائے گویا وہ اس کی بیوی نہیں جان کی دشمن ہے۔

منصور بھی چونکہ ٹھیٹھ مادہ پرست فولاد سے زیادہ سنگدل اور چکور سے زیادہ لالچی تھا، اس لئے اُسے بھی ایک بیٹے کی تمنا تھی، جو اس کے بعد اُس کی دولت و عزت کا وارث بنے۔ اور بیچاری سلمیٰ چونکہ اس کی اس تمنا کو پورا کرنے سے قاصر تھی، اس لئے وہ اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا اور اس کی خوبیوں کو بُرائیوں سے بھی بدتر سمجھتا تھا۔

غار میں پھلنے پھولنے والا درخت بار آور نہیں ہوتا اور سلمیٰ بھی چونکہ زندگی کے تاریک غار میں تھی اس لئے اُس کے ہاں بھی کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔

بلبل قفس میں آشیانہ نہیں بناتی، اس لئے کہ اپنے بچہ کو اسیری و غلامی میں دیکھنا اُسے گوارا نہیں اور سلمیٰ بھی چونکہ بدقسمت قیدی تھی، اس لئے مشیت الٰہی نہ ہوئی کہ اُس کی قید میں ایک اور وجود کا اضافہ ہو

وادیوں کے پھول، بچے ہیں، جو سورج کی توجہ اور زمین کی صلاحیت سے پیدا ہوتے ہیں اور انسان کے بچے پھول ہیں، جو محبت و میلان کی حرارت سے کھلتے ہیں، لیکن سلمیٰ اُس شاندار کوٹھی کے اندر جو بیروت کے بہترین حصہ میں ساحل سمندر پر واقع تھی، محبت اور میلان سے بالکل ناآشنا تھی، تاہم وہ رات کی خاموشیوں میں نمازیں پڑھتی اور اللہ سے گڑگڑا گڑگڑا کر ایک بچہ کے لئے دعائیں مانگتی، جو اپنی نرم و نازک انگلیوں سے اُس کے آنسو پونچھے اور اپنی آنکھوں کے نور سے اُن سیاہ اور خوفناک سایوں کو زائل کر دے جو اُس کے دل میں متحرک تھے۔

سلمیٰ اس طرح دردناک ہو کر دعائیں مانگتی کہ ساری فضا عجز و التجا سے لبریز

ہو جاتی اور اس طرح فریاد آمیز لہجہ میں گڑگڑاتی کہ اس کے نالہ و شیون بادلوں کا سینہ چیر دیتے یہاں تک کہ اللہ نے اس کی سن لی اور اس کی فضائے شکم کی خاموشیوں میں ایک شیریں اور روشن نغمہ منتشر کر دیا، شادی کے پانچ برس بعد وہ ایک بچہ کی ماں ہو رہی تھی، اتنی مدت کے بعد اب اس کے ماتھے سے کلنک کا ٹیکہ مٹ رہا تھا۔

نار میں پھوٹنے پھلنے والے درخت میں پھول آ گئے تھے اور پھل آنے والا تھا

مقید بلبل! قفس میں اپنے پروں سے آشیانہ بنانے پر تیار ہو گئی تھی!

قدموں میں پڑا ہوا رباب مشرقی ہوا کے رخ پر رکھ دیا گیا تھا تاکہ ہوا کی لہریں اس کے نیچے تاروں کو چھیڑ دیں!

بے چاری سلمیٰ نے آسمانی عطیہ کو بوسہ دینے کے لئے اپنے زنجیروں سے جکڑے ہوئے بازو پھیلا دئے تھے!

زندگی کی کوئی مسرت بانجھ عورت کی خوشی کا مقابلہ نہیں کر سکتی، جبکہ قانون قدرت اسے ماں بنائے حسن و جمال کی ساری رعنائیاں اور بہاریں اور آمد صبح کی ساری خوشیاں اور مسرتیں اس عورت کی کوکھ میں جمع ہوتی ہیں جسے اللہ نے ناامید کرنے کے بعد امیدوار کیا ہو۔

دنیا کی کوئی روشنی ان شعاعوں سے زیادہ روشن نہیں ہے۔ جو رحم مادر میں جنین کے وجود سے پھوٹتی ہیں۔

جب سلمیٰ پورے دنوں سے ہوئی تو بہار کا موسم تھا، گویا فطرت نے سلمیٰ سے پیمان باندھ رکھا تھا کہ وہ بھی اس کے بچے کے ساتھ سبزہ و گل کو حرارت کے نہاں خانوں سے کھلائے گی۔

مدت پوری ہو گئی اور سلمیٰ وضع حمل کا انتظار کرنے لگی جس طرح مسافر ستارہ سحر کا طلوع ہونے کا انتظار کرتا ہے مستقبل اسے اپنے آنسوؤں

کے پیچھے سے روشن نظر آرہا تھا جس طرح بسا اوقات تاریک چیزیں آنسوؤں کی جھریوں سے روشن نظر آتی ہیں۔

رات تاریک تھی اور فضا خاموش! بیروت کی تمام عمارتوں پر خوفناک سائے مسلط تھے کہ سلمیٰ کو دردِ زہ شروع ہوا، یعنی موت و حیات کی کشمکش شروع ہوگئی، اس کے بستر کے ایک طرف طبیب اور دایہ اس دنیا میں آنے والے ایک نئے مہمان کے خیر مقدم کے لئے کھڑے تھے۔ سڑک پر آمد و رفت بند اور سمندر.. کی موجوں کے نغمے مدہم ہو چکے تھے، سارا محلہ ساکت تھا، مگر منصور کے مکان کی کھڑکیوں سے آہ و فریاد کی دل ہلا دینے والی آوازیں برابر آرہی تھیں۔ —— ایک وجود سے دوسرے وجود کی انفصال کی آہ و فریاد! —— فضائے عدم میں شوق و دوام کی آہ و فریاد! —— لامتناہی قوتوں کی خاموشی کے سامنے انسان کی محدود قوت کی آہ و فریاد —— موت اور زندگی کے پہلوانوں کے قدموں میں پڑی ہوئی کمزور و ناتواں سلمیٰ کی فریاد!!

صبح کے وقت سلمیٰ کے ہاں لڑکا پیدا ہوا، بچہ کی رونے کی آواز سن کر اس نے اپنی آنکھیں جو درد و الم کی شدت سے بند تھیں اور چاروں طرف دیکھا اسے کمرہ میں ہر طرف مسرور و روشن چہرے نظر آئے لیکن جب اس نے نگاہ پھیری تو اپنے بستر کے قریب موت و حیات کو برسر کشمکش پایا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور کروٹ لیکر پہلی مرتبہ چلائی: "میرا بچہ!"

دایہ بچہ کو ریشمی نہالچہ میں لپیٹ کر ماں کے سامنے لے گئی لیکن طبیب غمگین نگاہوں سے سلمیٰ کو دیکھ رہا تھا اور بار بار رنج و افسوس کے زیر اثر اپنا سر ہلا رہا تھا۔

ہمسایوں میں خوشی کا غلغلہ بلند ہوا اور وہ لباس شب خوابی ہی میں بچہ

کی ولادت پر اس کے باپ کو مبارکباد دینے آ گئے، لیکن طبیب ماں اور بچہ کو اب بھی غمزدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

نوکر منصور کو بچہ پیدا ہونے کی خوش خبری سنانے اور اس پر انعام حاصل کرنے دوڑے۔ لیکن طبیب مایوس نگاہوں سے سلمٰی اور اس کے بیٹے کو کھڑا دیکھتا رہا۔

جب سورج نکلا تو سلمٰی نے اپنے بیٹے کو چھاتی سے لگایا، بچہ نے پہلی مرتبہ آنکھیں کھولیں۔ اور ماں کو دیکھا، اس کے بعد اس نے سسکی لی اور اس کی آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔

طبیب آگے بڑھا اور بچہ کو سلمٰی کی گود سے لے لیا، اُس کی آنکھوں سے زرد بڑے بڑے آنسو رخساروں پر ڈھلکے مری ہوئی آواز میں اُس نے کہا:

"آنے والا، رخصت ہو گیا!"

بچہ مر گیا اور اہل محلہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے منصور کے ساتھ خوشیاں مناتے اور اس کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگتے رہے۔ سلمٰی نے طبیب کو غور سے دیکھا اور چلائی:۔

"لاؤ! میرا بچہ، مجھے دو!!"

لیکن جب اسکی نگاہ پڑی تو اُس نے دیکھا کہ پلنگ کے پاس موت اور زندگی کے درمیان کشمکش برپا ہے!"

بچہ مر گیا اور جام و ساغر کی کھنک اس کی پیدائش پر خوشیاں منانے والوں کے دلوں کو گرماتی رہی۔

صبح سویرے پیدا ہونے والا، طلوعِ آفتاب کے وقت مر گیا۔

صبح سویرے پیدا ہونے والا، طلوعِ آفتاب کے وقت مر گیا۔ اور کوئی نہیں جو زمانہ کا اندازہ کر سکے!! اور ہمیں بتا سکے کہ کیا وہ ہنگامِ سحر اور طلوعِ آفتاب کی درمیانی ساعت، اُس زمانہ سے کم تھی جس میں قومیں اُبھرتی اور پھر موت کی نیند سو جاتی ہیں؟

آنے والا خیال کی طرح آیا، اور ٹھنڈے سانس کی طرح رخصت ہو کر سائے کی طرح چھپ گیا، سلمٰی مادرانہ کیفیت سے آشنا ہوئی، لیکن اُس کا بچہ کچھ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکا۔ جو اُسے کامیابیوں اور کامرانیوں سے دوچار کرتا اور اُس کے دل کو موت کے ظالم ہاتھوں سے چھڑاتا۔

ایک چھوٹی سی زندگی جو رات کے آخری حصہ میں شروع ہوئی اور صبح کے ابتدائی حصہ میں ختم ہو گئی، شبنم کے اس قطرہ کی مثال تھی جو ظلمت کی پلکوں سے ٹپکتا۔ اور سورج کی شعاعوں میں جذب ہو جاتا ہے

ایک کلمہ جو قانونِ قدرت نے ادا کیا تھا، مگر نادم ہو کر اُسے پھر ابدی خاموشیوں کے سینہ میں سلا دیا!

ایک موتی جسے سمندر کے چڑھاؤ نے ساحل پر پھینکا تھا مگر سمندر کے اُتار نے پھر اُسے گہرائیوں میں پہنچا دیا۔

ایک پھول جو کھلنے سے پہلے مرجھا گیا۔

ایک مہمان عزیز، جس کی سلمٰی منتظر تھی، آنے سے پہلے رخصت اور دروازہ کے کواڑ کھولنے سے پہلے غائب ہو گیا۔

ایک طفلِ شکم جو پروان چڑھنے سے پہلے خاک میں مل گیا۔۔۔ آہ!!

یہ ہے انسان کی زندگی!! صرف انسان ہی کی نہیں، قوموں کی زندگی!!! صرف قوموں ہی کی نہیں، مہر و ماہ اور ثوابت و سیار کی زندگی!!!

سلمٰی نے طبیب کی طرف دیکھا اور ٹھنڈا سانس لیکر چلائی:

"لاؤ! میرا بچہ! میں اُسے گود میں لوں گی۔ لاؤ! میرا بچہ!! میں اُسے دودھ پلاؤں گی!!"

طبیب نے سر جھکایا اور گھٹی ہوئی آواز میں کہا:

"بیگم! آپ کا بچہ اللہ کو پیارا ہوا، صبر کیجئے ورنہ آپ کی جان خطرہ پڑ جائے گی"

سلمیٰ نے ایک چیخ ماری اور خاموش ہو گئی، اُس کے ہونٹوں پر مسرت آمیز تبسم نمودار ہوا اور چہرہ چمک اٹھا، گویا اس پر ایک ایسی حقیقت ظاہر ہوئی ہے جو اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ اطمینان کے لہجہ میں اُس نے کہا:

"لاؤ! میرے بچہ کی لاش ہی مجھے دیدو!!

طبیب نے بچہ کی لاش سلمیٰ کے آغوش میں دیدی، سلمیٰ نے اُسے اپنے سینے سے چمٹا لیا اور دیوار کی طرف منہ کر کے مردہ بچہ سے خطاب کرنے لگی:

"میری جان! تم مجھے لینے آئے تھے، مجھے منزل مقصود کا راستہ دکھانے آئے تھے! دیکھو! میری جان!! میں یہاں ہوں۔ آؤ! میرے آگے آگے چلو تاکہ ہم اس تاریک غار سے نکل جائیں"

تھوڑی دیر کے بعد سورج کی شعاعیں، کھڑکی کے پردوں سے کمرہ میں داخل ہوئیں اور بستر پر پڑی ہوئی دو بے جان جسموں پر بکھر گئیں ——— وہ بستر، جو مادرانہ جلال کی حفاظت اور موت کے بازوؤں کے سائے میں تھا۔

طبیب روتا ہوا کمرہ سے نکلا، جب وہ دیوانخانہ میں پہنچا اور لوگوں کو

اس حادثہ کی اطلاع دی تو نغمہ ہائے مسرت، نوحہ و ماتم میں بدل گئے لیکن منصور نہ رویا پیٹا، نہ اس نے ٹھنڈا سانس بھرا، اس کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ نہ نکلا۔ نہ زبان سے کوئی لفظ، بلکہ وہ اپنے دائیں ہاتھ میں شراب کا جام لیے بت کی طرح خاموش کھڑا رہا۔

دوسرے دن سلمیٰ کو اس کے سفید عروسی لباس میں کفنا کر مخملی تابوت میں رکھا گیا، لیکن اس کے بچے کا کفن اس کا تہا لچہ، اس کا تابوت اس کی ماں کے بازو، اور اس کی قبر اس کی ماں کا خاموش سینہ تھا دونوں لاشوں کو ایک تابوت میں اٹھایا گیا اور لوگ آہستہ آہستہ چلنے شروع ہوئے، جیسے دو لڑنے والوں کے دل کی رفتار، میں بھی جنازہ کے ساتھ تھا لیکن اس طرح کہ لوگوں کو نہ یہ معلوم ہو سکا کہ میں کون ہوں اور نہ وہ یہ جان سکے کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔

جنازہ قبرستان پہنچا، پادری نے کچھ افسون پڑھے۔ اس کے بعد کچھ پادری تابوت کے ارد گرد کھڑے ہوئے اور انجیل مقدس کی کچھ آیتیں تلاوت کرنے لگے۔ لیکن ان کے چہروں پر جہالت اور بے کیفی کا پردہ پڑا تھا۔

جب تابوت قبر میں اتارا گیا تو ایک شخص نے کہا:

"میری عمر میں یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے ایک تابوت میں دو لاشیں دیکھی ہیں۔"

دوسرا بولا:

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچہ اپنی ماں کو لینے اور اسے شوہر کے ظلم و سنگدلی

سے نجات دلانے آیا تھا!"

تیسرے نے کہا۔

"ذرا منصور کو دیکھو، کس بے فکری سے آسمان کو دیکھ رہا ہے گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی!!"

چوتھے نے کہا:

"کیا ہے؟ کل اس کا چچا سلمیٰ سے زیادہ حسین اور مالدار لڑکی اُس سے بیاہ لائے گا۔"

پادری انجیل مقدس کی آیتیں پڑھتے رہے، یہاں تک کہ قبر پاٹ دی گئی۔ سب لوگ ایک ایک کر کے پادری اور اس کے بھتیجے کے پاس گئے، اور تسکین آمیز الفاظ میں انہیں صبر کی تلقین کرنے لگے، میں ایک گوشہ میں تنہا کھڑا تھا اور کوئی نہ تھا، جو میری مصیبت پر مجھے صبر دلاتا، گویا سلمیٰ اور اس کا بچہ مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز نہ تھے۔

لوگ واپس ہو گئے اور گورکن نئی قبر کے پاس کھڑا رہ گیا کدال پھاوڑہ اُس کے ہاتھ میں تھا۔ میں اس کے قریب گیا اور پوچھا۔

"کیا تم بتا سکتے ہو، فارس کرامہ کی قبر کہاں ہے؟"

وہ مجھے دیر تک دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اُس نے سلمیٰ کی قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"اسی قبر میں میں نے اُس کے سینہ پر اُس کی بیٹی کو سلایا، اور اُس کی بیٹی کے سینہ پر اُس کے بچہ کو اور ان سب پر اسی پھاوڑے سے مٹی ڈالی ہے۔"

میں نے کہا:

"اور اسی قبر میں، تو نے میرے دل کو بھی دفن کیا ہے۔ اُف!
کس قدر قوی ہیں تیرے بازو!"

جب گورکن سرو کے درختوں میں روپوش ہو گیا تو صبر کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں بے تاب ہو کر روتا ہوا سلمیٰ کی قبر پر گر پڑا۔

(سید وصی اشرف چشتی مالک کتبخانہ علم و ادب نے علیمی پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا)